انسان اور کائنات میں اللہ کی تجلّی

تألیف

محسن علی نجفی

جامعة الكوثر

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۵۳ (سورۃ فصلت: ۵۳)

ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یقیناً وہی (اللہ) حق ہے، کیا آپ کے پروردگار کا یہ وصف کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر خوب شاہد ہے؟

انسان اور کائنات میں

اللہ کی تجلی

تالیف

محسن علی نجفی

جامعۃ الکوثر

اسلام آباد - پاکستان

نام کتا :ب انسان اور کائنات میں اللہ کی تجلی

مؤلف: محسن علی نجفی دام ظلہ

کمپوزنگ: علی حیدری

تاریخ طبع: دسمبر ۲۰۱۷ء / جمادی الاول ۱۴۳۹ھ

تعداد: ۱۰۰۰

مطبع: اسد محمود پرنٹنگ پریس ۔ راولپنڈی

پیشکش: جامعۃ الکوثر ۔ اسلام آباد ۔ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

الحمد لله رب العالمین والصلوۃ والسلام علی اشرف الانبیاء و المرسلین وعلی آله الطاهرین۔

انسان کا اپنے اور اس کائنات کے بارے میں عموماً ایک موقف ہوتا ہے:

میں اس دنیا میں کس لیے ہوں؟

مجھے کسی نے بھیجا ہے یا میں اتفاقاً یہاں ہوں؟

مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟

میری زندگی کا کوئی مقصد ہے؟

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ نیست و نابود ہو جاؤں گا یا کوئی اور زندگی میرے انتظار میں ہے؟

یہاں دو موقف ہیں:

۱۔ الحادی مؤقف

۲۔ ایمانی مؤقف۔

۱۔الحادی مؤقف

اس مؤقف کے مطابق یہ کائنات اور انسان اتفاقاً از خود وجود میں آیا ہے اس کے وجود کے پیچھے کوئی عزم وارادہ کوئی حکمت و فلسفہ کوئی غرض و غایت کارفرما نہیں ہے۔ یہ بلا مقصد اتفاقاً وجود میں آیا ہے۔ بے مقصد زندگی گزارتا اور دکھ درد سہتا ہے۔ یہ لایعنی انسان نیچر کے ہاتھوں میں ایک بے مقصد کھلونا ہے۔ بالآخر بے مقصد کیڑے مکوڑے کی مانند نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

۲۔ ایمانی موقف

اس مؤقف کے مطابق یہ کائنات اور انسان بے مقصد کھلونا نہیں ہے۔ ایک حکیم ذات کی حکمت کاملہ کا عظیم مظہر ہے۔ اس حکیم ذات نے اس انسان کو احسن تقویم خلق فرمایا اور عزت و تکریم سے نوازا۔ اس کی زندگی کے سامنے ایک لازوال مقصد رکھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسے ایک طاقتور عقل عنایت فرمائی اور بے پایاں وسائل اس کے لیے مسخر فرمائے۔

یہاں ایک اہم سوال سامنے رکھتے ہیں: ان دونوں مؤقفوں میں پر امن موقف کون سا ہے؟

جواب یہ ہے:

اگر مرنے کے بعد الحادی مؤقف درست ثابت ہوا، انسان نیست و نابود ہو جائے گا۔

نابودشدہ کو کوئی ندامت یا عذاب نہیں ہو گا۔

اگر مرنے کے بعد ایمانی مؤقف درست ہوا تو ملحد کو ابدی عذاب، ندامت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لہٰذا ایمانی مؤقف پر امن اور عقلی ہے۔

دوسرے لفظوں میں مرنے کے بعد

نیستی ونابودی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ خطرہ ہست و بود کو ہے۔

لہٰذا ملحد کے مؤقف میں خطرہ

اور

مومن کے مؤقف میں امن ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے وجود، عظمت اور خالقیت پر کائنات اور انسان کے اپنے وجود میں بے شمار دلائل ودیعت فرمائے ہیں اور ان دلائل کو سمجھنے کے لیے عقل و فطرت کی ایک قوت عطا فرمائی ہے۔ دلائل طاقتور ہیں اور ان دلائل کو سمجھنے والی عقل بھی طاقتور ہے۔ ان دونوں طاقتوں کی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے فراہمی کے بعد انسان پر اللہ کی حجت پوری ہو جاتی ہے تاہم ان میں کمزوری آنے کی صورت میں تذکر اور یاد آوری کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے ہیں۔ اس کے بعد کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔

زیر نظر کتاب میں ان دونوں قوتوں یعنی آفاق و انفس میں دلائل کی قوت اور عقل و فطرت میں

انہیں درک کرنے کی قوت کے وجود پر ہم بحث کریں گے۔

آفاق و انفس یعنی کائنات اور انسانی نفسوں میں موجود دلائل توحید پر انسان بیرونی عوامل کے زیر اثر آئے بغیر اپنے ضمیر اور وجدان سے سرگوشی کرے اور مظاہر قدرت میں غیر جانبدار ہو کر غور کرے تو اسے کائنات کے ہر ذرے اور اپنے نفس کی ہر جنبش و خلیے میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات دیکھنے کو ملیں گی لیکن لوگ ان واضح معجزات سے غافلانہ اور کبھی معاندانہ گزر جاتے ہیں چونکہ ان معجزات کو قبول کرنے کی راہ میں خواہشات کی بڑی چٹان اور مفادات کا بڑا شیطان حائل ہے۔

غافل انسان خیال کرتا ہے کہ میں نے دانہ زمین میں کاشت کیا تو فصل نکل آئی۔ یہ اس کی زندگی کا معمول ہے۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وہ اس پر غور کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ یہ دانہ زمین میں جا کر کس طرح جڑیں پھیلاتا ہے اور اس کی جڑیں مطلوبہ عناصر کا انتخاب کس معجزانہ انداز سے کرتی ہیں۔ ان جڑوں کو مطلوبہ عناصر کی شناخت کیسے ہوئی۔ چنانچہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کا سوال ہے:

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ﴿٦٤﴾ [1]

یہ تو بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو۔ اسے تم اگاتے ہو یا اسے اگانے والے ہم ہیں؟

آیت سے ظاہر ہے کہ اگرچہ بونے کا عمل انسانی ہے لیکن اُگانا اس کے بس میں نہیں ہے۔

اسی طرح انسان خیال کرتا ہے کہ میں اپنے نفس پر حاکم ہوں۔ میں اٹھتا ہوں، چلتا ہوں، اپنے اعضاء و جوارح اپنی مرضی سے استعمال کرتا ہوں جب کہ غافل انسان متوجہ نہیں ہوتا کہ اگرچہ ارادہ اس کا ہے لیکن اس ارادے کا نفاذ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس کے نفاذ کے لیے قدرت نے ایک لشکر جرار تیار کیا ہے۔ اس کا پتہ اس غافل انسان کو اس وقت چلتا ہے جب اس پر فالج کا حملہ ہوتا ہے۔ اب وہ ہزار ارادہ کرے مگر اس کا ارادہ نافذ نہیں ہو گا۔

حدیث پر توجہ فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

من عرف نفسه فقد عرف ربّه۔ [2]

جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

میں نے اپنی محدود بساط کے مطابق یہ سعی کی ہے کہ قارئین کو آفاق اور انفس میں موجود دلائل

[1] سورة الواقعة: ٦٣۔٦٤

[2] بحار الانوار ٢: ٣٢

توحید کی طرف متوجہ کروں۔

اس تالیف کا محرک وہ فرمان ہے جو عالم باعمل، خطیب بے بدل حجۃ الاسلام علامہ سید رضی جعفر صاحب دامت برکاتہ العالیہ سے صادر ہوا۔ آپ نے اپنے محبت بھرے شیریں لہجے میں فرمایا:

> آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں الحاد کے رجحانات زیادہ دیکھنے میں آ رہے ہیں اور ان رجحانات کے محرکات بہت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سایہ رحمت تلے آنے کے عوامل کا فقدان ہے۔ لہٰذا رد الحاد کے موضوع پر ایک کتاب لکھو۔

اس فرمان نے میرے دل میں اسی قوت سے جگہ لی جو قوت آپ کے فرمان کے خلوص میں موجزن تھی۔

حدیث ہے:

الدال علی الخیر کفاعله۔[1]

کارخیر کی رہنمائی کرنے والا اس پر عمل کرنے والے کی طرح ہے۔

ان کے ایک اشارے کو میری زحمتوں کے برابر ثواب ملے گا بشرطیکہ میری زحمتوں میں وہی خلوص موجود ہو جو ان کے اشارے میں ہے۔

قابل ملاحظہ امر یہ ہے کہ اگر ہم کسی اسلامی موضوع پر تحقیق کرتے ہیں تو اسلامی مصادر قرآن و سنت سے براہ راست استفادہ کرتے ہیں جب کہ سائنسی موضوع پر کچھ لکھتے ہیں تو دوسروں کی تحریروں پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ کام دشوار ہے اور لغزش قلم کا امکان زیادہ ہے۔ لہٰذا دانشور حضرات سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میری لغزشوں سے مجھے آگاہ کریں تاکہ ان کی اصلاح ہو سکے۔

خداوند متعال سے دعا ہے کہ وہ میری اس حقیر کاوش کو بہت سے لوگوں کے لیے ابدی ضلالت سے نجات کا ذریعہ بنا دے۔ آمین

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

محسن علی بن مولانا اخوند حسین جان رحمۃ اللہ علیہ

اسلام آباد۔ پاکستان

۹ ذوالحجۃ الحرام ۱۴۳۸ھ بمطابق یکم ستمبر ۲۰۱۷ء

[1] بحار الانوار ۲: ۳۲

فطرت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا خدا پرستی فطری امر ہے؟

اس موضوع پر بعض جہات سے شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ہم یہاں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے بات کریں گے۔

فطرت کی لفظی تعریف

مادہ''ف ط ر'' شگاف پیدا کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دی جائے تو خلق و ایجاد کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا اطلاق صرف عدم سے ایجاد پر ہوتا ہے، نہ مطلق تخلیق پر۔

تعریف حقیقی

بعض اہل تحقیق نے فطرت کی یہ تعریف کی ہے:

فطرت احساس اور شناخت پر مشتمل تکوینی ہدایت ہے۔

یہ تکوینی ہدایت اکتسابی یعنی تعلیم و تربیت کے ذریعے نہیں بلکہ فطری ہے۔ یعنی اس مخلوق کی جبلت اور سرشت میں وجود میں آنے سے ہی موجود ہے۔تخلیقی مرحلے میں جہاں تخلیق کا عمل انجام پا رہا تھا وہاں یہ ہدایت بھی اس میں ودیعت ہوتی رہی ہے۔یعنی فطرت اس ہدایت کو کہتے ہیں جو خلقت کے ماوراء موجود ہے۔

چنانچہ انسانی تخلیق کردہ چیزوں میں یہ ہدایت موجود نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ گاڑی کا انجن بناتے ہوئے اس میں کسی قسم کی ہدایت ودیعت نہیں ہوسکتی۔

ہم آیندہ آپ کو بتائیں گے کہ فطرت اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کی ایک واضح دلیل ہے۔

انسانی خصلتیں

انسان میں تین قسم کی ارواح موجود ہیں:

۱۔ روح نباتی۔

۲۔روح حیوانی۔

۳۔ روح انسانی۔

۱۔ روح نباتی: روح نباتی کے تحت انسان کھاتا، پیتا، نشو ونما پاتا ہے۔

۲۔روح حیوانی: روح حیوانی کے تحت انسان آنکھوں سے دیکھتا ہے، کانوں سے سنتا ہے۔ دیگر حواس خمسہ روح حیوانی کے تحت ہیں۔

۳۔ روح انسانی: انسانی روح سے انسان فکر فردا کرتا ہے۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے جب کہ حیوانات صرف سامنے کی چیزیں دیکھتے ہیں۔ انسان مستقبل بینی کرتا ہے۔ معلوم سے مجہول تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ فکر، سوچ، دور اندیشی، خوب تر کی تلاش، خوب و بد میں تمیز کرتا ہے۔ عقل وفکر سے کام لیتا ہے۔ جمال پرستی کرتا ہے۔ علم حاصل کرتا اور خاندان تشکیل دیتا ہے۔

عفو، درگزری، ایثار و قربانی، عدالت خواہی، ظلم سے نفرت، آزادی طلبی، انتخاب کی صلاحیت، پاکیزگی کا رجحان، کثافت و پلیدی سے نفرت، حقائق تک رسائی اور سخاوت انسانی تقاضے ہیں۔

جب انسان اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو روح حیوانی سے اس کی جنگ ہوتی ہے۔ حیوانی روح غالب آنے کی صورت میں انسانی عقل کو اپنے مفاد یعنی خواہش پرستی کے تابع کر لیتی ہے۔

اگر روح انسانی غالب آجائے تو عقل کی حاکمیت قائم ہوتی ہے اور عقل آنکھوں کے بغیر دیکھنے لگتی ہے۔ ایسی باتیں اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں جو دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔

انسانیت مغز کی مانند ہے اور حیوانیت اس کی کھوپڑی ہے جو مغز کی حفاظت کرتی ہے۔

روح حیوانی کو سو فیصد غالب کرنا درست نہیں ہے۔ چنانچہ اس حیوانی روح کو سو فیصد نابود کرنا بھی درست نہیں ہے بلکہ روح حیوانی کو روح انسانی کی خدمت کے لیے مسخر کرنا چاہیے۔

غریزہ

غریزہ روح حیوانی کے تقاضوں کو کہتے ہیں۔ جیسے بھوک اور جنسی خواہشات ہیں۔ اگر بھوک کا غریزہ نہ ہوتا تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور جنسی خواہشات نہ ہوں تو نوع کی بقاء ممکن نہیں ہے۔

غریزہ کی دوقسمیں ہیں: ۱۔غریزہ جذب ۲۔ غریزہ دفع۔ بھوک، پیاس جنسی خواہش، مال دوستی، آسائش طلبی، غریزۂ جذب ہیں جب کہ غصہ، خوف، برائی سے نفرت غریزۂ دفع ہیں۔

فطریات

ماہرین نفسیات شروع میں تین چیزیں فطری قرار دیتے تھے:

حقیقت طلبی۔

احسان پسندی۔

جمالیاتی ذوق۔

بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ایک چوتھی چیز بھی فطری ہے۔ وہ ہے دینداری۔

ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

اول حقیقت طلبی: آگاہی و حقیقت جاننے کی خواہش و طلب انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ انسان اختیاراً اس سے دور ہونا نہیں چاہتا۔ حقیقت طلبی کبھی کسی مفاد کے تحت ہوتی ہے اور کبھی بےغرض۔ یعنی وہ کسی غرض سے نہیں بلکہ صرف حقیقت کی خاطر حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ کبھی انسان کسی حقیقت کے انکشاف کے لیے قربانیاں بھی دیتا اور بہت سی مشقتیں برداشت کرتا ہے۔

چنانچہ علوم میں ترقی اسی فطری محرک کی وجہ سے بھی آئی ہے۔ اگرچہ علم حاصل کرنے کے دیگر محرکات بھی ہیں جیسے اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی محرکات لیکن بنیادی محرک فطرت ہے جس کے بہت سے شواہد ہیں۔ کہتے ہیں ایک طالب علم مطالعے میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ شادی کی رات حجلہ عروسی میں جانا بھی بھول گیا۔

ابو ریحان بیرونی کا واقعہ مشہور ہے:

> حالت احتضار میں ایک فقیہ ان کی عیادت کے لیے آئے تو انہوں نے ان سے ایک فقہی مسئلہ دریافت کیا۔فقیہ نے کہا: اس وقت اس مسئلہ کی کیا ضرورت ہے؟ ابو ریحان نے کہا: مرنے سے پہلے میرا اس مسئلہ سے واقف ہونا بہتر ہے یا نا واقفی میں مرجاؤں، بہتر ہے؟ یہ سن کر فقیہ نے وہ مسئلہ بیان کیا۔تھوڑی دیر میں ابو ریحان کا انتقال ہو گیا۔

ہمارے مدرسہ جامعة اهل البیت(ع) اسلام آباد کی سڑک پر ہمیشہ ٹریف رواں دواں رہتی

ہے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ کبھی کوئی حادثہ ہو جاتا اور گاڑیاں ٹکرانے کی آواز آتی تو طلباء دوڑ کر جائے حادثہ پر پہنچ جاتے۔ صرف یہ جاننے کے لیے حادثے میں کیا نقصانات ہوئے ہیں۔ یہ جاننے کی تڑپ اس قدر شدید ہوتی کہ وہ آرام سے نہیں بلکہ دوڑ کر جاتے۔ انہیں حادثے کی صورت حال جاننے کی بھی جلدی ہوتی۔

دوم احسان پسندی: دوسروں سے احسان اور نیکی سے پیش آنے کا رجحان فطری ہے۔ کسی کی فریاد رسی کرنے میں اپنی غرض شامل نہیں ہوتی۔ کبھی غرض مند ہوتا بھی ہے لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ دوسروں کی فریاد رسی کرنا انسانی فطرت کی آواز ہے۔ چنانچہ تمام انسان ایثار و قربانی پسند کرتے ہیں خواہ خود نیکی اور احسان کرنے والے نہ بھی ہوں۔

کوئی شخص کسی آدمی کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اسے کھائی میں گرتے دیکھتا ہے تو لپک کر اسے گرنے سے بچا لیتا ہے۔ اس کا محرک صرف فطرت ہی ہے۔

سوم جمالیاتی ذوق: انسان فطری طور پر خوبصورتی پسند کرتا ہے اور خوبصورت چیزیں دیکھ کر خوش ہوتا اور لذت محسوس کرتا ہے۔ جمالیات پرستی ماقبل تاریخ سے انسانوں میں رائج تھی اور وسائل کی فراوانی میں جمالیات کو مزید وسعت ملتی ہے۔

چہارم دینداری: ہر شخص کے وجدان و ضمیر میں اس کائنات کے خالق کا تصور موجود ہے اور وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔

ماہرین نفسیات سنہ ۱۹۲۰ء میں اس طرف متوجہ ہوئے اور اس موضوع پر ایک جرمن ماہر نفسیات کا اہم مقالہ سنہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا جس میں اس کی وضاحت ہے کہ یہ انسان کی جبلت میں رچی بسی ہے۔

اس سلسلے میں فرانس کے ایک دانشور کہتے ہیں:

> آج کل ایک فکری حرکت ہو رہی ہے کہ روز بروز مختلف مکاتب کے مفکرین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ دینداری کی حس، روح انسان کی طبیعت اور مزاج کے ابتدائی عناصر اور بنیادی ترین باتوں میں شامل ہے جو کسی اور قوت و طاقت سے قابل تغیر نہیں ہے۔

سوال: یہ چار باتیں اگر فطری ہیں تو فطری باتیں ہر انسان میں ہوا کرتی ہیں ورنہ وہ فطری نہیں

ہیں۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ نہ صرف یہ کہ دوسروں پر احسان اور نیکی نہیں کرتے بلکہ ان کے خون میں اپنا لقمہ تر کرتے ہیں۔

جمالیاتی احساس سے بھی بہت سے لوگ بے خبر ہیں۔علم دوستی بھی کچھ لوگوں میں نہیں ہوتی اور والدین جتنا بھی جبر کریں بچہ پڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ دینداری کی حس تو اکثر لوگوں میں معدوم ہے۔

جواب: کسی بات کے فطری ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فطری تقاضا پورے کرنے پر مجبور ہے بلکہ فطری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ضمیر و وجدان میں اس کا رجحان موجود ہے۔ یہ رجحان مثبت تربیت سے پروان چڑھتا اور منفی تربیت سے اس میں کمزوری آتی ہے اور کبھی یہ رجحان وقتی طور پر معدوم ہوجاتا ہے اور جب بیرونی منفی دباؤ ہٹ جائے تو فطرت کے تقاضے بیدار ہو جاتے ہیں۔

کوئی شخص زندگی میں پہلی بار قتل کرتا ہے۔فطرت فوراً اسے اپنی عدالت میں پیش کرتی اور سزا دیتی ہے جسے ہم ضمیر کی ملامت کہتے ہیں۔ جب دوسری بار قتل کرتا ہے تو ضمیر کی عدالت سے ملنے والی سزا نرم ہو جاتی ہے۔ جب قتل کا سلسلہ جاری رکھتا ہے تو اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور نہ کوئی عدالت لگتی ہے نہ سزا ملتی ہے جسے ہم مردہ ضمیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس قسم کے مردہ ضمیر جب قابل ہدایت نہیں رہتے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ جب ہدایت کا سرچشمہ ایسے لوگوں سے ہاتھ اٹھا لے تو اسے ہدایت ملنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ کسی کو اس کے حال پر چھوڑ دینا اللہ کی بڑی سزا ہے۔

دینداری اور انسانیت: حقیقت یہ ہے کہ دینداری انسان کی انسانیت سے مربوط ہے۔ یعنی جب سے انسان اس کرۂ ارض پر وجود میں آیا ہے اپنے خالق کی طرف متوجہ رہا ہے۔ اس وقت جب انسان دلیل قائم کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

هم فطرت کو انسان میں ایک اور انسان کا کہہ سکتے ہیں۔ داخلی انسان کبھی بھی نافرمان نہیں ہوتا وہ حجت ہے۔ حجت معصوم ہوتی ہے۔ یعنی جسے ہم عقل اور فطرت کہتے ہیں وہ داخلی انسان، حجت خدا ہے۔ جب کہ ظاہری انسان نافرمان ہوسکتا ہے۔ جب ظاہری و داخلی انسان ہم مزاج، ہم عقیدہ اور ہم آہنگ ہو جائیں تو ان میں اطمینان وسکون آ جاتا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔[1]

یاد رکھو! یاد خدا سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

[1] سورۃ الرعد: ۲۸

جب خواہش پرست ظاہری انسان، داخلی پاکیزہ انسان یعنی فطرت کے خلاف جاتا ہے تو نظام درہم برہم اور سکون سلب ہو جاتا ہے:

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا...۔[1]

اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اسے یقیناً ایک تنگ زندگی نصیب ہو گی....

كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ....۔[2]

گویا وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو....۔

چنانچہ نفسیاتی بیماریاں صنعتی ترقی یافتہ ممالک میں عام ہیں۔مشہور ماہر نفسیات پروفیسر جنگ سی جی (professor Jung C G) کہتے ہیں:

> گزشتہ تیس سالوں میں ترقی یافتہ ممالک سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں نے مجھ سے اپنی نفسیاتی بیماری کے علاج کے لیے مشورہ مانگا۔ چنانچہ پینتیس سال سے زائد عمر کے لوگوں کی بیماری صرف مذہبی عقیدے سے محروم ہونا تھی۔

یہ مطلب اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

> ان کی بیماری یہ تھی کہ وہ اس چیز سے محروم تھے جو دینداری سے اس دین پر ایمان رکھنے والوں کو ملتا تھی۔ ان میں سے کسی کو شفا صرف دینی عقیدے کی طرف لوٹنے سے ملی ہے۔[3]

اس جگہ پروفیسر کریسی موریسن (Professor Krissy Morrison) جو نیویارک اکیڈمی کے سربراہ رہ چکے ہیں، کی باتیں قابل توجہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> انسانی حشمت، احترام، سخاوت، اخلاقی عظمت، انسانی قدریں اور اعلیٰ درجے کا شعور سب عطیہ الٰہی ہیں جو الحادی نظریے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ الحاد ایک قسم کی انانیت ہے کہ انسان اللہ کی کرسی پر بیٹھنا چاہتا ہے۔
>
> دین اور عقیدے کے بغیر یہ تمدن تباہ اور نظام بدنظمی کا شکار ہو جائے گا۔ ضبط نفس اور توازن ختم ہو جائے گا۔ انسانیت منتشر ہو جائے گی۔ لہٰذا اللہ سے رابطہ رکھنا ہی

---

[1] سورة طٰہٰ:۱۲۴

[2] سورة الانعام:۱۲۵

[3] ملاحظہ ہو الاسلام یتحدی

بنیادی ضرورت ہے۔

انسان میں اللہ تعالیٰ کا تصور ہونے کی وجہ سے انبیاء (ع) کی دعوت کو پذیرائی ملی ہے اور انبیاء (ع) سے تذکر آنے پر فطرت میں جنبش آجاتی ہے۔

مٹی پر بارانی پانی پڑنے سے مردہ خاک جس طرح جنبش میں آتی اور زمین بیدار ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امیر المومنین علی علیہ السلام کا انبیاء (ع) کے مبعوث ہونے کے بارے فرمان ہے کہ انبیاء (ع) اس لیے مبعوث ہوئے:

لیستادوھم میثاق فطرتہ ویذکروھم منسی نعمتہ ....۔[1]

تاکہ فطرت سے کیا ہوا عہد و میثاق پورا کرایا جائے اور اللہ کی فراموش نعمتیں یاد دلائی جائیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ہر جگہ اپنی دعوت کو تذکر (یاد آوری) کی تعبیر سے ذکر فرماتا ہے اور قرآن مجید کے اسماء میں ایک کثیر الاستعمال نام الذکر ہے۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ○[2]

وَ اِنَّہٗ لَذِکۡرٌ لَّکَ وَ لِقَوۡمِکَ....۔[3]

فَذَکِّرۡ ۟ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَکِّرٌ ○[4]

تذکر و یاد آوری وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی مطلب جان چکا ہو پھر اسے فراموش کر دے۔

کسی بات کے فطری ہونے کے بعد اس کے تقاضے ظاہر ہونا اس صورت میں ممکن ہے جب فطرت اپنی فطری حالت میں محفوظ ہو اور اس کے تقاضوں کی مخالف اور متضاد طاقتیں موثر نہ ہوں۔ اگر فطری تقاضوں پر اس کی متضاد طاقتیں غالب آجائیں تو فطری امور مؤثر نہیں ہوں گے۔

فطرت کی مخالف قوتیں: فطرت کی مخالف طاقتیں درج ذیل ہیں:

اول۔ احساس بے نیازی: انسان اگر دنیوی عیش و عشرت کے وسائل سے مالا مال ہے تو اپنے آپ کو بے نیاز تصور کرتا ہے کیونکہ تصورِ احتیاج انسان کو احتیاج پوری کرنے والی ذات کی طرف

---

[1] نہج البلاغۃ: خطبہ ۱

[2] سورۃ الحجر: ۹ (ترجمہ) اس ذکر کو یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

[3] سورۃ الزخرف: ۴۴ (ترجمہ) اور یہ (قرآن) آپ کے اور آپ کی قوم کے لیے ایک نصیحت ہے۔

[4] سورۃ الغاشیۃ: ۱۲ (ترجمہ) پس آپ نصیحت کرتے رہیں کہ آپ فقط نصیحت کرنے والے ہیں۔

متوجہ کرتا ہے۔ اسی لیے ہم پوری تاریخ انسانیت میں دیکھتے ہیں کہ غریب طبقہ انبیاء (ع) کی دعوت پر لبیک کہتا ہے چونکہ ان میں فطری تقاضے زندہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ اگر انسان مال و دولت کی وجہ سے اپنے آپ کو بے نیاز تصور کرتا ہے تو وہ دعوتِ انبیاء کو (ع) ٹھکرا دیتا ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ کٰفِرُوۡنَ ○[1]

اور ہم نے کسی بستی کی طرف کسی تنبیہ کرنے والے کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے مراعات یافتہ لوگ کہتے تھے: جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔

نیز اس سلسلے میں یہ آیت قابل توجہ ہے:

کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۙ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ؕ﴿۷﴾[2]

ہرگز نہیں! انسان تو یقیناً سرکشی کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرتا ہے۔

نیز ارشاد الٰہی ہے:

وَاِذَاۤ اَنۡعَمۡنَا عَلَی الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِہٖ ....[3]

اور جب ہم انسان کو نعمتوں سے نوازتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور اپنی کروٹ پھیر لیتا ہے ....

دوم۔ **تکبر اور خود بینی:** فطری تقاضوں کے خلاف جو باتیں مؤثر ہیں ان میں سے ایک تکبر اور خود بینی ہے۔ متکبر اپنے آپ کو اس سے بالاتر سمجھتا ہے کہ وہ اللہ کی بندگی اور غریبوں کی فریاد رسی کرے۔ وہ کسی انسان کا اللہ کی سفارت کے مقام پر فائز ہونا گوارا نہیں کرتا۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ اسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ۚ فَفَرِیۡقًا کَذَّبۡتُمۡ ۫ وَفَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ ○[4]

تو کیا جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات کے خلاف (احکام لے کر) آئے تو تم اکڑ گئے، پھر تم نے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو تم لوگ قتل کرتے رہے؟

[1] سورة سباء: ۳۴

[2] سورة العلق ۶/۷

[3] سورة الاسراء: ۸۳

[4] سورة البقرة: ۸۷

سوم۔ظن پرستی: اکثر گمراہ لوگ علم و یقین کی جگہ ظن و تخمین اور کبھی وہم و گمان کی بھی پیروی کرتے ہیں۔ جب یقین کی جگہ وہم و گمان لے لیتے ہیں تو فطریات جو یقینیات پر مشتمل ہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

چنانچہ روز مرہ زندگی میں عموماً لوگوں کو وہم پرستی میں مبتلا دیکھتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا...۔[1]

ان میں سے اکثر محض ظن کی پیروی کرتے ہیں جب کہ ظن انسان کو حق (کی ضرورت) سے ذرہ برابر بے نیاز نہیں کرتا....۔

قرآن اور فطرت دینی

قرآن مجید نے واضح بیان فرمایا ہے کہ انسانی فطرت میں اللہ کی ربوبیت کا شعور کس طرح ودیعت فرمایا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ○[2]

اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور ان پر خود انہیں گواہ بنا کر (پوچھا تھا): کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا تھا: ہاں! (تو ہمارا رب ہے) ہم اس کی گواہی دیتے ہیں، (یہ اس لیے ہوا تھا کہ) قیامت کے دن تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔

17 قرآن کے مطابق انسان کا ابتدائی اور اصلی دین توحید ہے۔ شرک بعد میں پیدا ہوا۔ مغربی مصنفین پہلے خیال کرتے تھے کہ انسان کا ابتدائی دین شرک تھا اور توحید تک بہت بعد میں پہنچا لیکن اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ انسان کا ابتدائی دین توحید تھا۔

اس آیت اور احادیث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تخلیق اولاد آدم کے موقع پر اولاد آدم سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تھا لیکن علماء اور مفکرین پر واضح نہیں ہوا کہ کیا یہ اقرار اور عہد و میثاق

---

[1] سورة یونس:۳۶

[2] سورة الاعراف: ۱۷۲

مافوق شعور سے لیا گیا تھا یا اسے انسان کے تحت شعور، فطرت و جبلت میں ودیعت کیا گیا تھا؟

ایک مؤقف کے مطابق اللہ تعالیٰ نے صلب بنی آدم سے قیامت تک ہونے والی تمام نسلوں کو ذرات کی شکل میں بیک وقت پیدا کیا اور انہیں عقل وشعور دیا۔ انہیں قوت گویائی عطا کی اور ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا۔ بعد میں ان ذرات کو صلب بنی آدم میں واپس کر دیا۔ کہتے ہیں کہ جیسا کہ کل بروز قیامت تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کر کے ان سے حساب لیا جائے گا بالکل اسی طرح کل عالم ذر میں بھی سب کو بیک وقت جمع کر کے ان سے عہد و اقرار لیا گیا تھا۔

دوسرے مؤقف کے مطابق اللہ نے تخلیق آدمؑ کے موقع پر ان کی فطرت اور سرشت میں معرفت رب ودیعت فرمائی۔ جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○[1]

پس (اے نبی) یکسو ہو کر اپنا رخ دین (خدا) کی طرف مرکوز رکھیں (یعنی) اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہے، یہی محکم دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

حدیث میں وارد ہوا ہے:

کل مولود یولد علی الفطرۃ۔[2]

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ (یعنی فطرت توحید پر)

ہمارے نزدیک یہی موقف قرین واقع ہے۔ اس موقف پر دیگر آیات قرآنی کے ساتھ احادیث کا ایک قابل توجہ مجموعہ شاہد ہے۔ لہٰذا ہم اس آیت کی اس طرح تشریح کر سکتے ہیں:

جب اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اولاد آدم کی پشتوں سے آگے چلایا تو اس وقت ان نسلوں کی جبلت میں جن تارہائے زندگی سے ان کے وجود کی بافتگی ہوئی ہے، ان تاروں میں اپنے رب کی شناخت ودیعت فرمائی۔ ودیعت بھی اس طرح راسخ کی کہ وہ خود اپنی ذات پر گواہ بن جائیں: وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ - أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ

[1] سورۃ الروم: ۳۰
[2] سورۃ البقرۃ: ۸۷

کی آواز پہچان کر بَلٰی کے ساتھ اقرار کریں۔

حضرت علی علیہ السلام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے بارے میں فرماتے ہیں:

فَبَعَثَ فیهِمْ رُسُلَه وَ واتَرَ الَیهِمْ اَنْبیائَهُ لیسْتادُوهمْ میثَاقَ فطْرَته....[1]

اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور اپنے اَنبیاء (علیہم السلام) کا سلسلہ جاری رکھا تا کہ ان کو اپنی فطرت کے عہد و میثاق کی ادائیگی کی دعوت دیں۔

اس سلسلے میں جدید سائنسی معلومات کو اگر دلیل تسلیم نہ کیا جائے تو ان سے تائید ضرور حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی تخلیق میں کام آنے والے اربوں خلیوں کی پیدائش ایک خلیہ سے ہوئی ہے اور جو سبق ابتدائی خلیے میں موجود جین کو پڑھایا گیا ہے، وہ سبق آنے والے تمام خلیات میں بطور وراثت منتقل ہو جاتا ہے۔ تمام زندہ موجودات کے لیے جبلی ہدایات اللہ تعالیٰ نے خلیے (Cell) کے مرکزی حصے DNA میں ودیعت فرمائی ہیں جو تین ارب نہایت چھوٹے سالموں پر مشتمل ہیں اور حیات کا راز انہیں سالموں میں پوشیدہ ہے۔ DNA میں کئی سیکشن ہوتے ہیں جنہیں جین (GENE) کہتے ہیں اور جین ہی میں وہ نقشہ ہوتا ہے جس پر آگے چل کر انسان کی شخصیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

ممکن ہے اسی طرح کا کوئی عمل وقوع پذیر ہوا ہو جس کی تفصیل اور کیفیت کا ہمیں علم نہیں ہے۔ تاہم انسان نے اب تک اس سلسلے میں جو پیشرفت کی ہے اور کسی حد تک عالم خلیات میں جھانک کر دیکھا اور تخلیق و تعمیر پر مامور اس محیر العقول لشکر کی حیرت انگیز کرشمہ سازیوں کا مشاہدہ کیا ہے اس سے اس بات میں کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا تو نسل انسانی کی جبلت کے ابتدائی خلیے کو اللہ کی ربوبیت کا درس پڑھایا ہو اور پھر اس سے اس کا اقرار لیا ہو۔ انسان اس کی کیفیت کما حقہ نہیں سمجھ سکتا، اس لیے آیت میں تمثیلی انداز اختیار کیا گیا۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ....[2]

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا....

انسان نفسانی خواہشات، منفی تربیت و ماحول اور دیگر عوامل کی وجہ سے فطری تقاضوں سے منحرف ہو جاتا ہے۔ مثلاً علم و احسان دوستی سب کے نزدیک انسانی فطری تقاضوں میں شامل ہے، اس

---

[1] نہج البلاغۃ ص ۴۳ خ ۱

[2] سورۃ الاحزاب: ۷۲

کے باوجود دیگر عوامل غالب آنے کی وجہ سے انسان، علم دوست ہوتا ہے اور نہ احسان پسند۔ البتہ انسان کو اگر علم و احسان کی دعوت دی جائے تو وہ فطرت کی آواز پہچان لیتا ہے۔

اگر انسان سے یہ عہد و میثاق نہ لیا گیا ہوتا تو انسان کے لیے معرفت حق ممکن نہ رہتی یا بالفاظ دیگر انسانی جبلت میں معرفت رب کی صلاحیت ودیعت نہ ہوئی ہوتی تو رب کی معرفت نہ ہوتی۔ دونوں مؤقفوں کا کہنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس قدیم عہد و میثاق کو یاد دلانے کے لیے آئے ہیں۔ اگر یہ قدیم عہد و میثاق نہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو ہرگز پذیرائی نہ ملتی۔ یعنی اگر انسان کے وجود میں توحید کی طلب نہ ہوتی تو دعوت انبیاء علیہم السلام کی رسد کا کوئی خریدار نہ ہوتا۔ نقاش ازل نے نقش توحید لوح دل پر کندہ کر دیا تھا۔ اس لیے آج انبیاء علیہم السلام کے یاد دلانے پر انسان اس تحریر کو پڑھ لیتا ہے ورنہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت صدا بصحرا ثابت ہوتی۔

معرفت نقش ہو گئی واقعہ بھول گئے
یعنی سبق یاد ہے، کلاس بھول گئے

روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو آپؑ نے فرمایا:

> ثبتت المعرفة فی قلوبهم و نسوا الموقف و سیذکرونه یوماً ولو لا ذلك لم یدر احد من خالقه ولا من رازقه۔[1]
>
> لوگوں کے دلوں میں معرفت نقش ہو گئی لیکن واقعہ بھول گئے۔ ایک دن انہیں واقعہ بھی یاد آئے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی کو علم ہی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کا خالق و رازق کون ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس عہد و میثاق کی کیفیت خواہ کچھ ہو اس سے معرفت حق انسان کے وجود میں نقش ہو گئی اور معرفت حق کی صلاحیت آ گئی۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح کہنا چاہیے کہ اگرچہ وہ کلاس کے تفصیلی واقعات تو بھول گیا لیکن سبق یاد ہے۔

ہماری بحث بھی اسی سبق سے ہے جو انسان کو یاد ہے۔ اگر انسان کی فطرت میں سرے سے کوئی بات موجود ہی نہ ہوتی تو کسی طاقت کے بس میں نہیں تھا کہ وہ بات اس میں پیدا کرے۔ مثلاً اگر انسان میں تعلیم کی صلاحیت بالکل مفقود ہوتی تو کوئی طاقت انسان کی سرشت میں یہ صلاحیت شامل نہیں کر

[1] مجلسی: بحار الانوار ۳:۲۸۰

سکتی اور اگر یہ صلاحیت انسان کی سرشت میں موجود ہو تو کوئی طاقت اسے ختم نہیں کر سکتی، البتہ منحرف کر سکتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اگر ایسا کوئی عہد و میثاق عمل میں آیا تھا تو وہ ہمارے شعور و حافظے میں کیوں نہیں ہے؟ ہم میں سے کسی کو علم ہی نہیں کہ ہم نے کسی اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ کے جواب میں "ہاں" کہی تھی اور جب یہ یاد ہی نہیں تو ہمارے خلاف حجیت کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ ہم اگر بھول گئے ہیں تو کلاس کی تفصیلات بھول گئے ہیں لیکن سبق تو ہمیں یاد ہے۔ اسی وجہ سے ہم فطرت کی آواز پہچانتے اور اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ...[1]

پس (اے نبی) یکسو ہو کر اپنا رخ دین (خدا) کی طرف مرکوز رکھیں، (یعنی) اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہے، یہی محکم دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔[2]

۱۔ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ: مشرکین کی طرف سے ہونے والی تکذیب و تمسخر اور خواہش پرستی کی پرواہ کیے بغیر اپنی ساری توجہ دین پر مرکوز رکھیں اور اپنے موقف پر استقامت کے ساتھ قائم رہیں،

۲۔ حَنِيۡفًا: پوری یکسوئی کے ساتھ باطل نظریات سے لاتعلق اور تمام غیر اللہ سے بے نیاز ہو کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر تکیہ کر کے۔

۳۔ فِطۡرَتَ اللّٰهِ: اللہ کی فطرت کی طرف اپنی ساری توجہ مرکوز رکھیں: اعنی فطرة الله۔ جس دین کی طرف اپنی پوری توجہ مرکوز رکھنے کا حکم ہے وہ اللہ کی فطرت سے عبارت ہے۔ وہ دین فطری تقاضوں سے عبارت ہے۔ دین ایک جبری اور مسلط کردہ چیز نہیں ہے۔ وہی فطرت اور جبلت میں موجود تقاضے ہیں۔

۴۔ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا: فطرت وہ اساس اور بنیاد ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا

[1] سورة الروم: ۳۰
[2] آئین بندگی ص ۱۷ تا ۲۲

ہے اور دین بھی اسی اساس اور بنیاد پر قائم ہے چونکہ دین زندگی کے لیے ایک دستور حیات کا نام ہے۔ جس نے حیات بخشی ہے اسی نے اس حیات کے لیے دستور عنایت فرمایا۔ لہٰذا اس دستور اور حیات میں تصادم نہیں ہوسکتا بلکہ یہ دستور اس حیات کے تمام تقاضوں کے مطابق ہی ہوسکتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات تخلیق فرمائی تو اس وقت کائنات کی ہر چیز میں وہ باتیں ودیعت فرمائیں جو ان چیزوں کی بقا و ارتقا کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ○[1]

موسیٰ نے کہا: ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

واضح رہے فطرت کے تقاضے ماورائے خلقت ودیعت ہوئے ہیں خود خلقت نہیں ہیں۔ جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے کہ خلقت کے بعد ہدایت اس میں ودیعت ہوئی ہے۔ پس جس طرح تمام موجودات کی بقا و ارتقاء کے لیے ضروری ہدایات اور سوجھ بوجھ ان میں ودیعت ہوئی ہے بالکل اسی طرح شریعت نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

فطرت میں اس بات کی سوجھ بوجھ ودیعت فرمائی کہ معاشروں میں عدل و انصاف ہونا چاہیے۔ شریعت نے اس کی تفصیل بیان کی کہ عدل و انصاف کس طرح قائم ہوسکتا ہے:

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۪ۙ﴿۷﴾ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۪ۙ﴿۸﴾[2]

اور (قسم ہے) نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا، پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔

پس فطرت میں بدکاری اور اس سے بچنے کی سوجھ بوجھ موجود ہے۔ شریعت نے اس کی تفصیل بیان کی ہے کہ بدکاری کون سی چیزیں ہیں اور اس سے بچنے کے طریقے کون سے ہیں۔

اللہ نے توحید اور معرفت رب فطرت میں ودیعت فرمائی۔ شریعت نے اس کی تفصیل بیان کی کہ معرفت رب کے تقاضے کیا ہیں۔

لہٰذا فطرت اور شریعت میں اگر کوئی فرق ہے تو اجمال و تفصیل کا ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام فطرت کے اجمال کی تفصیل بیان کرنے کے لیے مبعوث ہوئے۔ اسی لیے فطرت، انبیاء علیہم السلام کی آواز

[1] ۲۰سورۃ طٰہٰ:۵۰
[2] ۹۱سورۃ الشمس:۷۔۸

پہچانتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو پذیرائی ملتی ہے ورنہ غیر فطری مسلط شدہ چیز کو پذیرائی نہ ملتی اور ندائے اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ کا مثبت جواب بَلٰی نہ ملتا۔

لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ: اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ تخلیق سے مراد فطرت ہے۔ فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ تمام انسانوں کی فطرت ایک ہے۔ نوع ایک ہے۔ مصلحت ایک ہے۔ رہنما بھی ایک ہے۔ فطرت ہی رہنما ہے۔ ہادی میں تبدیلی نہیں اور ہدایت میں بھی تبدیلی نہیں ہے۔ اگر کہیں انسانی فطرت میں انحراف آ جائے تو دین دوبارہ فطرت کی طرف واپس کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین تمام ادوار اور تمام اقوام کی ضرورت ہے۔

ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ: فطرت اور شریعت کی یہ وحدت دین قیم ہے۔ دین اور انسانی فطرت قابل تفریق نہیں ہے۔

دین کے فطری ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اقامہ دین کے لیے کوشش کی ضرورت نہیں: فَاَقِمۡ وَجۡهَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا...۔

دین ہر انسان کی فطرت و جبلت میں رچا بسا ہے: فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا...۔

دین کو فطرت کا سہارا حاصل ہے اور محکم ہے: ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ...۔

فطری تقاضے ماند پڑ جاتے ہیں نابود نہیں ہوتے: لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ...۔[1]

فطرت اور کشش

جس طرح عقلی منطقی دلائل سے حقائق ثابت ہوتے ہیں اسی طرح انسان میں موجود کشش اور رجحانات سے بھی راستوں کا تعین ہوتا ہے۔

انسان اپنی زندگی کے مسائل میں ہمیشہ عقل اور منطق کا انتظار نہیں کرتا چونکہ ایسا کرنے سے کبھی انسان کے بنیادی مسائل معطل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً انسان کھانا کھانے یا جنسی تعلقات قائم کرنے کے لیے منطقی دلیل قائم ہونے کا انتظار کرتے کہ اگر کھانا نہ کھایا تو زندہ نہیں رہ سکیں گے اور جنسی تعلقات قائم نہ کرنے کی صورت میں نسل انسانی کی بقاء خطرے میں پڑ جائے گی تو انسان کی اس خطہ ارضی پر بقاء ممکن نہ ہوتی۔

جب کہ جنسی خواہشات کا غریزہ اور کھانا کھانے کی خواہش انسان کو اس پر آمادہ کرتی ہے اور

---

[1] الکوثر فی تفسیر القران ج ۶ ص ۳۵۷ تا ۳۶۰

جس قدر مقصد اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس میں عمومیت ہوتی ہے اس کی کشش طاقتور ہوتی ہے۔

اس کشش کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم کی کشش وہ ہے جو فکر و عقل استعمال کیے بغیر اس پر آمادہ کرتی ہے۔ جیسے کھانا اور جنسی خواہشات۔ چنانچہ ان دونوں کی طرف حیوانات بھی لپکتے ہیں جو عقل و فکر نہیں رکھتے۔

دوسری کشش وہ ہے جس میں عقل و فکر کا اثر ہوتا ہے اور عقل ہی اسے انتخاب و اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ چنانچہ قسم اول کو غریزہ اور دوسری کو فطرت کہتے ہیں۔

خدا پرستی فطری تقاضوں کے تحت تمام انسانوں کے وجود میں ودیعت ہوئی ہے۔ یہ صرف ایک دعویٰ نہیں ہے بلکہ اس پر بہت سے شواہد موجود ہیں کہ خدا پرستی فطری ہے:

۱۔ پوری انسانی تاریخ میں خدا پرستی کا ہونا دلیل ہے کہ یہ کوئی عادت نہیں بلکہ فطرت ہے۔ عادت تو بعض انسانوں میں ہوتی ہے اور بعض میں نہیں۔ چنانچہ تاریخ کے بڑے ماہرین کا کہنا ہے:

> جہاں تک انسانی تاریخ کا کھوج لگایا گیا اور ماقبل تاریخ تک رسائی ہوئی ہے کوئی معاشرہ لادینی بنیادوں پر استوار دیکھنے میں نہیں آیا۔

ول ڈیورنٹ (Will Durant) کہتے ہیں:

> اگر ہم دین کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ دین نیچر سے بالاتر طاقت کی پرستش کا نام ہے تو درست ہے۔ سوائے چند ایک نادر مواقع کے دین تمام انسانوں کو شامل کرتا ہے جو حقیقت کے مطابق ہے۔ یہ کسی فلسفی کے لیے تاریخ کی بنیادی بات ہے اور وہ اسے قبول نہیں کرے گا کہ تمام ادیان لغو اور باطل ہیں بلکہ وہ اس طرف متوجہ ہے کہ دین قدیمی ایام سے انسانی تاریخ سے وابستہ ہے۔

آخر میں وہ ایک بامعنی سوال اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

> اس تقویٰ کا سرچشمہ کہاں ہے جو انسان کے دلوں سے نہیں نکل سکتا؟

یہی مورخ دوسری جگہ کہتے ہیں:

> اگر ہم ماقبل تاریخ میں مذہب تصور نہ کریں تو پوری تاریخ میں مذہب کو کماحقہ نہیں سمجھ سکیں گے۔

کھدائی کے ذریعے ماقبل تاریخ انسانوں کا حال جاننے کی کوششوں سے بھی یہی حقائق ثابت

ہوتے ہیں۔

چنانچہ معروف ماہر معاشرہ ساموئل ٹاگ (Samuel Tog) کہتے ہیں:

آج کل کے انسانوں کے اسلاف نئینڈر تل (Neanderthal) مذہب کے پابند تھے۔

وہ اپنے مدعا کے اثبات میں کہتے ہیں:

آثار قدیمہ سے ملنے والے شواہد سے معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنے مردوں کو ایک خاص کیفیت میں دفن کرتے اور چند ایک چیزیں بھی ان کے ساتھ دفن کرتے تھے۔ ان سے ان کے عقیدۂ آخرت کا علم ہوتا ہے۔

فقیہ عالی قدر آیۃ اللہ محسنی دام ظلہ اپنی کتاب عجائب و مطالب میں رقمطراز ہیں:

ہماری معاصر تاریخ بھی گواہ ہے کہ بعض ملحد نظاموں نے لوگوں سے دین کا عقیدہ سلب کرنے کے لیے بے پناہ توانائیاں صرف کیں لیکن وہ دین لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں سے نکال باہر کرنے سے عاجز رہے۔

چنانچہ رشیا (روس) ستر سال تک اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لایا کہ لوگ دین کا عقیدہ ترک کر دیں لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔

یہ خود مذہب کے فطری ہونے کی ایک دلیل ہے۔

روسیوں نے گزشتہ ستر سالوں میں کئی ملین انسانوں کو قتل کیا اور کئی ملین صفحات، اوراق، کتب شائع کیں اور پورے وسائل ابلاغ، ریڈیو ٹیلی ویژن وغیرہ مذہب ذہنوں سے نکالنے اور کمیونزم مذہب قبول کرانے پر لگا دیے مگر وہ اس میں بھی ناکام ہو گئے۔

آگے لکھتے ہیں:

ماسکو میں افغانستان کے سفیر عارف خان کہتے ہیں:

ایک روسی سرجن سے میری دوستی ہوگئی۔ ایک دن میں اس ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا: میں ایک مریض کا علاج کر رہا ہوں۔ پوری انسانی تاریخ کے تجربات کی روشنی میں یہ گیارہ مشینیں بنائی گئی ہیں جن کے ذریعے میں نے اس مریض کو مرنے

سے صرف پندرہ منٹ پہلے بچایا ہے۔ اگر میں تھوڑی تاخیر کرتا تو یہ مر جاتا۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟

میں نے کہا: آپ کا یہ عمل ایک انسانی عمل ہے جس سے آپ ایک انسان کی جان بچا لیتے ہیں۔

روسی ڈاکٹر نے کہا: میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمام انسانوں کے تجربات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ گیارہ مشینیں مرنے سے پندرہ منٹ پہلے مریض کے جسم سے متصل ہوں تو اسے زندہ رکھتی ہیں۔ اگر میرا آپریشن پندرہ منٹ میں مکمل نہ ہوتا تو سولہویں منٹ میں اس مریض نے مر جانا تھا۔ میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ وہ طاقت جو اس دل کو ستر، اسی سال سے متحرک رکھے ہوئے ہے، کون ہے؟

میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ روس کے قلب ماسکو میں رہتے ہیں اور آپ کو علم ہے کہ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں کا یہاں کیا حشر ہوتا ہے۔

روسی ڈاکٹر نے کہا: ہاں! میرا رسمی مذہب الحاد ہے اور لوگوں سے جب مذہب کے بارے میں بات ہوتی ہے تو میں اللہ کے وجود کا انکار کرتا ہوں۔ مگر سفیر صاحب! میں انسان ہوں۔ میرا وجدان ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اللہ کا وجود تسلیم نہ کروں۔ جو اللہ کا منکر ہو وہ گدھا ہو گا۔ اللہ کا انکار اپنے اور دوسروں کے وجود کا انکار ہے اور ممکن نہیں ہے کہ کوئی عاقل اللہ پر ایمان نہ رکھتا ہو۔

اسی کتاب میں ایک جگہ آپ اپنے ترکی نژاد استاد سے نقل کرتے ہیں:

انہوں نے دوران درس فرمایا:

باد کوبہ آذربائجان میں مقامی مسلمانوں اور روسی کمیونسٹوں میں جنگیں ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک جنگ میں کمیونسٹوں نے شکست کھائی۔ ایک کمیونسٹ مبلّغ کو دیکھا کہ وہ فرار ہوتے ہوئے کہہ رہا ہے: خدا! خدا! اللہ کی پناہ! اور اللہ سے اپنی سلامتی مانگ رہا تھا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد ایک دن میں نے اس سے پوچھا: آپ امن و آرام کے

دنوں میں اللہ کا انکار کرتے رہے۔ الحاد کے موضوع پر کیا کچھ نہیں کہتے رہے اور لوگوں کو بھی انکار خدا کا لیکچر دیتے رہے۔ اس دن کیا ہوا جب آپ بھاگ رہے تھے، اللہ کو یاد کر رہے تھے اور اللہ سے مدد مانگ رہے تھے؟

کمیونسٹ مبلغ نے کہا: انکار خدا کی تبلیغ کرنا میری نوکری ہے جس کے عوض میں تنخواہ لیتا ہوں لیکن انسان ہونے کے اعتبار سے میں وجدان رکھتا ہوں۔ میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ میں خدا کا منکر ہو جاؤں۔ میں کوئی گدھا ہوں کہ اللہ کا منکر ہو جاؤں۔[۱]

فرانس کے روزنامہ لیمنڈ (lemonde) کے مطابق فرانس میں پچاس فیصد لوگوں کا خیال ہے کہ دین کو گزشتہ دس سالوں کی نسبت زیادہ پزیرائی ملی ہے۔[۲]

فطرت و اخلاق

انسان میں موجود اخلاقی قدریں فطرت میں ودیعت شدہ قدروں کی طرف سے ہیں۔

انسان فطری طور پر اچھے اخلاقی کاموں کو شرافت مندی تصور کرتا ہے جیسے ایثار اور انصاف ہیں۔ انہیں انجام دینے سے خود کو نیک اور بڑا نسان تصور کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی فطرت اللہ کو جانتی ہے لیکن وہ اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ وہ اللہ کے قوانین جانتی ہے۔ اللہ کی خوشنودی بھی جانتی ہے اور انسان نیک کام فطری طور پر برائے رضائے خدا انجام دے رہا ہوتا ہے لیکن خود نہیں جانتا کہ برائے رضائے خدا انجام دے رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے اس کام سے اس کا ضمیر خوش ہوتا ہے لیکن وہ متوجہ نہیں کہ اس کے ضمیر کا خوش ہونا فطرت کی جانب سے ہے اور فطرت اللہ کی طرف سے ہے۔ اس طرح اس کے ضمیر کا خوش ہونا اللہ کی خوشی کے آثار ہیں۔

اس مقام پر شہید مطہری (رح) کا ایک خوبصورت قول قابل ذکر ہے:

> انسان ایک شرافت و کرامت کا مالک ہے جو عطیہ الٰہی ہے۔ وہ اس کرامت کا احساس کرتا ہے۔ بعد میں وہ ان اعمال و کردار میں یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ کون سا کام اس کی شرافت سے مناسبت رکھتا ہے اور کون سا نہیں۔ جب محسوس کرتا ہے کہ یہ کام اس کی شرافت و کرامت سے ہم آہنگ ہے تو اسے نیک تصور کرتا ہے اور جو کام

[۱] عجائب و مطالب صفحہ ۵۸
[۲] عجائب و مطالب

اس کی شرافت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے تو اسے برا سمجھتا ہے۔
خوب و بد، ہونا چاہیے، نہیں ہونا چاہیے کا یہ کلی معیار ہے۔
کمالات نفسانی میں تمام انسان یکساں ہیں۔ جب یکساں ہیں تو سب کی پسند ایک ہو جاتی ہے۔ سب لوگ ایک رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ سب کا نظریہ یکساں ہوتا ہے۔ جب کہ یہی لوگ جسامت، طبیعت و مزاج میں مختلف ہوتے ہیں اور مختلف حالات میں مادی ضروریات بھی مختلف ہیں۔ اس کے باوجود کمالات نفسانی میں تمام انسان یکساں نظر آتے ہیں اور سب کی پسند و ناپسند، خوب و بد یکساں اور دائمی ہے اور تمام اخلاقی فضائل خواہ اجتماعی ہوں یا غیر اجتماعی اسی معیار پر تولے جاتے ہیں۔
شہید مطہری (رح) کی اس تقریر سے اس آیت کریمہ کی وضاحت ہو جاتی ہے جس میں فرمایا:
وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۞ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۞[1]
اور قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا، پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔
چنانچہ نفس انسانی میں یہ پیمانہ ودیعت کیا گیا ہے کہ کون سا عمل نیک ہے اور کون سا بد ہے۔
اگر کوئی سوال کرے:

آج کے صنعتی ترقی کے زمانے میں انسان کو ضرورت کی تمام چیزیں میسر ہیں۔ مسافتیں کم ہو گئی ہیں۔ حتیٰ فضائیں بھی مسخر ہو گئی ہیں اور تقریباً بہت سے قدرتی وسائل انسان کی دست رسی میں آ گئے ہیں۔ ان حالات میں دین کی کیا ضرورت ہے؟ دین کی ضرورت اس وقت تھی جب انسان اپنی محرومیوں کا مداوا دین میں تلاش کرتے تھے۔ آج محرومیت ختم ہو گئی ہے۔ دین کی ضرورت بھی ختم ہے۔

اس کا جواب آج کے ترقی یافتہ معاشروں سے پوچھ لیں:
کیا صنعتی ترقی نے دین کی جگہ لے لی ہے اور مادی وسائل کی فراوانی سے انسان کو سکون میسر آ گیا ہے؟ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے انسان جنہیں ہم خوش حال کہتے ہیں خوش بھی ہیں؟

[1] سورۃ الشمس:۷۔۸

ایک سروے کے مطابق دنیا کا کوئی خوشحال ملک خوش نہیں ہے اور جو ملک خوشحال نہیں ہے وہ زیادہ خوش ہے۔ چنانچہ اس رپورٹ کے مطابق بنگلہ دیش سب سے زیادہ خوش ملک ہے۔ اشتراکی ممالک نہ خوش ہیں، نہ خوشحال۔

ایک خبر چھپی تھی کہ امریکا میں ایک جوڑے نے تفریح کے لیے جانے کا پروگرام بنایا لیکن بارش کی وجہ سے وہ تفریح پر نہ جا سکا۔ دونوں نے خودکشی کر لی۔ توجہ رہے مشرق کا انسان تفریحی پروگرام منسوخ ہونے کی وجہ سے چائے کی ایک پیالی بھی نہیں چھوڑے گا جبکہ صنعتی ترقی یافتہ اور مادیت کا انسان اپنی جان چھوڑ دیتا ہے۔

فطرت سے سوال

ایک اہم سوال آپ فطرت سے کر سکتے ہیں:

کیا وجہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کی ضروریات فراہم ہونے پر خوش، مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر گھر نہیں تو چھت ملنے پر خوش ہوتا ہے۔ اگر لباس نہیں تو لباس ملنے پر سکون ملتا ہے۔ اگر کھانے کے لیے کچھ نہیں تو کھانا ملنے پر اطمینان حاصل ہوتا ہے لیکن جب اس کے پاس ضرورت سے زیادہ سرمایہ آ جائے تو بے سکون ہو جاتا ہے؟

ایک مزدور سکون کی زندگی گزار رہا تھا، سکون کی نیند سوتا تھا۔ اچانک اس کی لاٹری نکل آئی، کروڑوں کا مالک بن گیا۔ سکون چھن گیا اور نیند حرام ہو گئی۔

اس سے واضح ہے کہ مادی وسائل دین کا متبادل نہیں ہیں۔

ایک سوال اور پیدا ہو سکتا ہے:

کیا سائنسی پیشرفت سے دین کی ضرورت ختم نہیں ہو جاتی؟

جواب یہ ہے کہ اگر سائنس دین کی جگہ لیتی ہے تو انیسویں بیسویں خصوصاً اکیسویں صدی میں دین کی ضرورت ختم یا کم ہونی چاہیے تھی جب کہ سائنس انسان کو اخلاقی ضمانت اور درست نظریہ حیات فراہم نہیں کر سکتی۔

تمام اقوام وملل اپنے زمانے کے طرز تفکر کے مطابق ایک مافوق الفطرت طاقت پر ایمان رکھتی تھیں۔

فرائیڈ **(Freud)** بومیان **(Totem)** کی قوم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ قوم وحشی اور آدم خور ہونے کے باوجود ایک قوت بنام توتم **(totem)** پر ایمان رکھتی تھی۔

ما قبل تاریخ کے دہانے تک کی جستجو میں مذہب کے بغیر کوئی قوم اور زمانہ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ آثار قدیمہ اور زمین کے طبقات کی تحقیقات کرنے پر بھی کوئی لا مذہب جگہ اور زمانہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

طبیعت، اس سرشت کو کہتے ہیں جس کی بنیاد پر مادی چیزیں تخلیق ہوتی ہیں۔

حضرت امام ابوالحسن علیہ السلام سے روایت ہے:

طبائع الجسم على اربعة:

فمنهاالهواء الذى لا تحيا النفس الابه وبنسيمه ويخرج ما فى الجسم من داءوعفونة

والارض التى قد تولدالیبس والحرارة

الطعام ومنه يتولد الدم الا ترى انه يصير الى المعدة فتغذية حتى يلين ثم يصفو فتاخذالطبيعة صفوه دما ثم ينحدر مع الثفل

والماءوهويولدالبلغم.[1]

جسم کی طبیعتیں چار ارکان پر قائم ہیں:

۱۔ ہوا اور نسیم۔ چنانچہ ہوا کے بغیر زندگی ممکن نہیں اور سانس کے ذریعے جسم میں موجود بیماری اور کثافت (کاربن ڈائی آکسائڈ) باہر پھینک دی جاتی ہے۔

۲۔ زمین۔ اس سے خشکی اور حرارت پیدا ہوتی ہے۔(چونکہ زمین سورج کی حرارت کومحفوظ کرتی ہے)

۳۔ غذا۔ غذا سے خون بنتا ہے۔ چنانچہ غذا معدے میں جاتی ہے تو معدہ اسے نرم اور پھر صاف کر دیتا ہے۔ پھر اس غذا کے عمدہ حصے کا خون بنا کر طبیعت اسے جذب کر لیتی ہے اور باقی ماندہ فضلہ باہر پھینک دیتی ہے۔

۴۔ پانی۔ پانی سے بلغم پیدا ہوتا ہے۔

فطری وغیر فطری میں فرق

ذیل میں چند امور کی ہم وضاحت کرتے ہیں جن سے فطری اور غیر فطری امور میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔

پہلی علامت: کسی بات کے فطری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ انسان کی جبلت، اس کی

[1] الکافی ۸:۲۳۰

ذات اور طبیعت سے وابستہ ہے۔ لہٰذا فطری بات انسان میں ہر حالت، ہر ذات، ہر علاقے اور ہر زمانے میں موجود ہوا کرتی ہے۔ زمان، ذات، علاقہ بدلنے سے اس میں تبدیلی نہیں آتی۔ تمام انسان تمام زمانوں میں اس بات کو اپنی ذات اور جبلت کا لازمہ تصور کرتے ہیں۔ یعنی فطری بات، انسان کی انسانیت کا لازمہ ہے جس طرح چار کا جفت ہونا لازمہ ہے۔ اس میں علاقائی، عادات و رسوم کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ جیسے عدالت اچھی اور ظلم بری چیز ہے۔ ایسی بات کو فطری کہتے ہیں۔

اس کی دوسری مثال ماں کی ماں کا فطری ہونا ہے۔ ماں کی بچے کے ساتھ محبت ماں کی ذات کا لازمہ ہے۔ کسی تعلیم و تربیت، علاقائی اور قبائلی عادات و مراسم کے تابع نہیں ہے۔

دوسری علامت: فطری امور کسی تعلیم و تربیت پر موقوف نہیں ہوتے اگرچہ تربیت سے فطری امور کو جلا ملتی ہے۔

تیسری علامت: فطری امور سیاسی، جغرافیائی اور اقتصادی عوامل کے تابع نہیں ہوتے۔

چوتھی علامت: فطری امور کے خلاف پروپیگنڈوں، سازشوں سے ان میں کمزوری آ سکتی ہے، ان کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔

جب کہ غیر فطری امور:

۱۔ کسی مکان و زمان سے مربوط ہوتے ہیں۔

۲۔ بیرونی عوامل سے ختم ہو جاتے ہیں۔

۳۔ تعلیم و تربیت کے زیر اثر آتے ہیں۔

۴۔ مخالف پروپیگنڈوں سے ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کیا مذکورہ علامتیں دینداری میں موجود ہیں؟

ذیل میں اس پر روشنی ڈالتے ہیں:

۱۔ پوری تاریخ انسانی میں دینداری کا موجود ہونا

انسانی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں پر عیاں ہو گیا ہے کہ دینداری کوئی ایسی بات نہیں ہے جو انسانی وجود کے ساتھ نہیں بعد میں پیدا ہوئی ہو بلکہ انسان کے ساتھ ساتھ دینداری موجود رہی ہے اور قدیم ترین انسانی تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنے والوں پر واضح ہو گیا ہے کہ مختلف اقوام، علاقوں اور مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے سب ایک معبود کے قائل تھے جو ان کے آداب و رسوم اور روایات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ ان کے آثار قدیمہ، تمدن سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مختلف قبائل و اقوام کا کھوج

لگانے والوں نے اس کی گواہی دی ہے۔
ذیل میں چند ایک اشخاص کا ذکر کرتے ہیں۔
فقیہ عالی قدر آقای محسنی دام ظلہ اپنی تالیف عجائب و مطالب میں لکھتے ہیں:

دینی عقائد سے خالی دنیا کا تصور ممکن نہیں ہے۔

شکاگو یونیورسٹی کے شعبہ اخلاق و سیاست کی استاد مارتھا نوسباوم Martha (Nussbaum) کا عقیدہ ہے:
آج کل ہم جس کا مشاہدہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ لوگ دین کو نظر انداز کرتے ہیں اور آزادی ڈیموکریسی کی رٹ لگاتے ہیں حالانکہ دین کے بغیر دنیا کا تصور ناممکن ہے۔
مہر نیوز ایجنسی کے مطابق یہ شکاگو یونیورسٹی کی استاد ہیں اور ہمارے معاصر فلاسفروں میں صف اول کی فلسفی ہیں۔ وہ اپنی تحقیقات میں اجتماعی وسیاسی مسائل پر برملا گفتگو کرتی ہیں۔انہوں نے ایک نئی کتاب ''امریکہ میں دینی مساوات'' کے موضوع پر لکھی ہے۔
وہ اپنی بعض تحقیقات میں کہتی ہیں:
اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دین والے انسانی کرامت یعنی انسانی عزت و تکریم اور اس کی بنیادوں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور یہ سب اس زندگی کا مقصد تلاش کر رہے ہیں اور زندگی کے مقصد کی تلاش کا بہترین سرچشمہ خود انسان کا وجدان ہے۔ لہذا تمام انسان خواہ وہ مخالف ہوں یا موافق وہ مقصد حیات پر تحقیق کر سکتے ہیں۔[1]
کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر جان ایورتھ کہتے ہیں:
اقوام عالم میں کسی بھی قوم کی ثقافت اور تمدن دینی تصور سے خالی پانا ممکن نہیں ہے۔ دین کی جڑیں تاریخ کی انتہائی گہرائی میں موجود ہیں اور غیر معروف تاریخ میں بھی ثابت ہیں۔
نیز کہتے ہیں:
اگر تاریخ ہمارے لیے دلیل بنتی ہے تو ماضی اور انسانی تاریخ سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے

[1] عجائب و مطالب ص۳۰۶

ہیں کہ انسان اپنے وجود میں یہ احساس رکھتا ہے کہ کسی بلند تر طاقت کے سامنے جھکنا لازمی ہے۔ یعنی وہ طاقت جو تمام حقائق کی سرچشمہ ہے۔[1]

شوپن ہاور (Schopenhauer) نے کہا ہے: انسان میٹافیزیکل حیوان ہے۔

پاسکل (Pascl) کہتے ہیں: اللہ کے وجود پر گواہی دینے والا قلب ہے، عقل نہیں ہے۔

پردون فرنسی کہتے ہیں:

عقل سے اللہ کے وجود کا انکشاف ہوتا ہے اور قلب اس کی گواہی دیتا ہے۔

فری مین ڈائسن (Freeman Dyson) کہتے ہیں:

جوں جوں میں کائنات کو دیکھتا اور اس کی ساخت کا مطالعہ کرتا ہوں اتنا میرے اس یقین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے اسے ہماری آمد کی پیشگی اطلاع مل چکی ہوگی۔[2]

کیلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر رام چندرن نے انسان کے جسم پر نماز کی حیرت انگیز تاثیر کا پتہ چلایا ہے۔ رام چندرن نے امریکہ کے بعض سکالرز کے ساتھ مل کر انسانی جسم پر نماز کے مترتب ہونے والے حیرت انگیز اثرات پر تحقیقات کیں تو نماز کی حالت میں انسانی دماغ کی فعالیت میں اضافے اور روحانی طور پر سکون حاصل ہونے کا علم ہوا۔ اس سائنسی تحقیق سے پتہ چلا کہ نماز شروع کرنے کے پچاس سیکنڈ بعد یہ حالت شروع ہو جاتی ہے۔

اس تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آیا ہے کہ نماز کی حالت میں دل کی دھڑکن اور دوران خون میں بھی بیس سے تیس فیصد تک کمی آجاتی ہے اور جسم کے بیرونی حصے (جلد) میں مقاومت کی طاقت زیادہ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح حالت نماز میں نمازی کے مغز کی جو تصاویر لی گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ حالت نماز میں نمازی کا دماغ دوسرے حالات کی بہ نسبت زیادہ فعال ہو جاتا ہے اور نمازی کے مغز کی اعصابی رگوں سے نورانی شعاعیں اٹھنا شروع ہو جاتی ہیں۔

اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اس بارے میں لکھا ہے:

ان سائنسی تحقیقات سے انسانی مغز کے داخلی اسرار واضح ہوئے ہیں۔

[1] ملاحظہ ہو الدين فی تجارب الحياة البشرية۔

[2] مختصر تاریخ موجودات

اخبار سائنس نے اس قسم کی تحقیقات کو سراہتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے دین اور سائنس میں مضبوط ربط کی وضاحت ہو جاتی ہے۔[1]

۲۔ احساس دینداری

انسان اگر کسی دینی ماحول اور تربیت سے دور رکھا جائے تو بھی بلوغ کی عمر سولہ سال میں خود بخود دین کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اس عمر کا جوان اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اس کائنات کو کس نے پیدا کیا۔ ہمیں کس نے، کس لیے پیدا کیا ہے؟ یہ باتیں اس کی فطرت سے اس کے ذہن میں ابھرتی ہیں۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ انسان جب سن بلوغ یعنی سولہ سال کو پہنچتا ہے تو اس کے دینی احساسات بیدار ہونے لگتے ہیں۔ اگر یہ بچہ دیندار گھرانے میں پلا بڑھا ہے تو سولہ سال کی عمر میں اس میں اللہ تعالیٰ سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۳۔ دینداری ماحول کی پیداور نہیں

فطری امور کا تعلق ماحول سے نہیں، انسان کی ذات سے ہے۔ چنانچہ سب کے مشاہدے میں ہے کہ دینداری مختلف ملکوں، معاشروں، روایات و عادات اور مختلف علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ آپ دنیا کے جس کونے میں جائیں وہاں اذانوں اور ناقوس کی آوازیں سنائی دیں گی یا مساجد، چرچ، مندر، اور دیگر عبادتگاہیں دیکھنے کو ملیں گی۔ ایسا نہیں ہے کہ بعض قوموں میں دین کا تصور ہے اور بعض میں نہیں ہے۔

۴۔ دینداری طاقت سے ختم نہیں کی جا سکتی

دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض الحادی طاقتوں نے طویل مدت تک ذہنوں سے دینی تصور نکالنے کی ہر ممکن کوشش اور اپنی پوری طاقت استعمال کی۔ عبادت گاہوں کو طاقت کے ذریعے بند کرا دیا لیکن جب لمبی مدت کے بعد جبر اٹھ گیا تو عبادت گاہیں دوبارہ آباد ہونا شروع ہو گئیں۔ روس اور دیگر کمیونسٹ ممالک میں اسی طرح دیکھنے میں آیا ہے۔

چنانچہ لینن گراڈ کی مسجد میں مذہبی تعطیلات کے دنوں میں بارہ ہزار افراد جمع ہوتے ہیں اور اسلامی عیدوں کے دنوں میں ماسکو کی مسجد کے علاوہ علاقے کی گلیاں بھی لوگوں سے پر ہو جاتی ہیں۔

ایمان اور کردار

دین انسان کے کردار کا مثبت مؤثر اور داخلی محرک ہے۔ اگر محرک انسان کے داخل میں نہ ہوتو

---

[1] عجائب و مطالب از فقیہ عالی قدر حضرت محسنی دام ظلہ۔ کابل

بیرونی عوامل کے ذریعے کردار پر اثر وقتی ہوگا اور کردار بھی ماند پڑ جائے گا۔

انسان کی تہذیب و تربیت کا داخلی مثبت محرک دین فراہم کرتا ہے۔ یہ محرک چونکہ انسان کی انسانیت سے پھوٹتا ہے لہٰذا دائمی اور ہر حالت میں موجود رہتا ہے۔

اگر دین سے فراہم ہونے والے مثبت عوامل نہ ہوں تو انسان کے منفی محرکات اور عوامل فعال ہو جاتے ہیں اور معاشرے میں بے حیائی اور شہوت پرستی غالب آ جاتی ہے جیسا کہ ہم مغربی معاشروں میں دیکھ رہے ہیں:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ ...۔[1]

اور جو لوگ کافر ہو گئے وہ لطف اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں تو جانوروں کی طرح کھاتے ہیں....۔

چنانچہ جس میں مثبت قدروں کو کردار میں مجسم کرنے کے عوامل موجود نہ ہوں اس سے معاشرے کو کوئی بھلائی نہیں ملتی:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝[2]

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

برہان فطرت

یہ برھان احتیاج کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس طرح کہ ہر چیز اپنی جگہ محدود ہے اور ان سب کا تعلق و ربط ایک لامحدود ذات سے ہے۔ ہر شخص اور ہر موجود اپنے ذاتی ارادے کے تابع نہیں ہے۔ نہ اپنے ارادے سے آیا ہے، نہ اپنے ارادے سے اس دنیا سے کوچ کرتا ہے بلکہ اسے لایا اور لے جایا جاتا ہے۔

نطفہ ٹھہرنے سے لے کر شکم مادر سے باہر آنا، بڑا، جوان اور بوڑھا ہونا وہ مراحل ہیں جو انسان اپنے اختیار سے طے نہیں کرتا۔ میں خود آیا نہیں ہوں تاکہ خود یہاں سے چلا جاؤں بلکہ جو مجھے یہاں لایا ہے وہی مجھے لے جائے گا۔

اس جگہ انسان کے ارادے کا سلب ہونا دلیل ہے کہ کوئی ہے جو اپنے ارادے سے مجھے یہاں لایا اور اپنے ارادے سے مجھے یہاں سے اٹھائے گا۔

[1] سورۃ محمد: ۱۲
[2] سورۃ الماعون: ۱۔۲

موجوداتِ ہستی سب کی سب فقر و احتیاج سے عبارت ہے۔ ان سراپا محتاجوں کے لیے غیر محتاج ذات سے مربوط ہونے کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔ جب یہ موجودات اپنے وجود کے لیے محتاج ہیں تو ان کی محتاجی کسی غیر محتاج سے دور ہو گی تو وجود میں آسکیں گی۔

اگر وہ وجود میں آنے کے لیے کسی اور کی محتاج نہیں ہیں تو جسے ہم نے محتاج کہا تھا اس کا غیر محتاج ہونا لازم آئے گا۔ چنانچہ محتاج ہونے کے ساتھ غیر محتاج ہونا قابل تصور نہیں ہے۔

برہان امکان

ذرے سے کہکشاؤں تک کل کائنات دو حال سے خالی نہیں ہے:

یہ ازل سے موجود ہے کسی کی محتاج نہیں ہے۔ اسے علم الکلام میں واجب الوجود کہتے ہیں کہ یہ بذات خود موجود ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ کائنات بذات خود وجود میں نہیں آئی بلکہ اسے وجود دینے والے سے وجود ملا ہے۔ اس طرح وجود ان دو صورتوں سے خالی نہیں ہے:

کائنات اگر بذات خود موجود ہے تو یہ ازلی ہے۔ اس کے وجود کی کوئی ابتدا نہیں ہے۔

سائنسی طور پر مسلم ہو گیا ہے کہ کائنات ازلی نہیں ہے۔ یہ عدم سے وجود میں آئی ہے۔

پس یہ کائنات کسی وجود دینے والے سے وجود میں آئی ہے۔

دین کی پیدائش کے محرکات

الحادی نظریہ رکھنے والے دین کو انسان کا اپنا پیدا کردہ وہم قرار دیتے ہیں۔ ذیل میں ان نظریات کو بیان کرتے ہیں پھر ان پر تبصرہ کرتے ہیں۔

ا۔ خوف

وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے قدرتی حادثات کا خوف۔

ول ڈیورینٹ کہتے ہیں:

> کسی کو معبود بنانے کی اصل وجہ موت کا خوف ہے۔ ابتدائی انسان کو طبعی موت بہت کم آتی تھی۔ بیشتر حادثات اور بیماریوں کی وجہ سے موت واقع ہوتی تھی۔ اس لیے ابتدائی سادہ لوح انسان یہ نہ سمجھ سکے کہ موت ایک طبعی چیز ہے بلکہ اسے مافوق طبیعت سے منسوب کیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے حادثات کے عوامل اس وقت کا انسان نہیں سمجھ سکتا تھا، نہ ہی ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس طرح ایک معبود فرض کر لیا کہ وہ ان کی مدد کرے اور مدد ملنے کا شکر ادا کرنے کے لیے اس کی پوجا کریں۔[1]

اس کے بعد رسل (Bertrand Russell) نے اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہا:

دین کی پیدائش کے تین اسباب ہیں:

الف: حادثات کا خوف۔ جیسے بادل کی گرج، بجلی کی چمک، زلزلہ، سیلاب وغیرہ جن سے کبھی نقصانات ہوتے اور کبھی زندگی کو خطرہ ہوتا ہے۔

ب: آپس کی لڑائیوں اور جنگوں کی وجہ سے اٹھنے والے نقصانات۔

ج: جنسی خواہشات سے سرزد ہونے والی خلاف ورزیوں کے خوف کی وجہ سے۔

ان وجوہات سے پناہ طلب کرنے کی خواہش نے دین کا تصور جنم دیا۔

جوابات

ان مفروضات کے چند جوابات ہیں:

۱۔ اول تو یہ صرف مفروضے اور ظن و تخمینے ہیں جو علمی شواہد پر مبنی نہیں ہیں۔

۲۔ ایسے مفروضے ان باتوں کے بارے میں قائم کیے جاتے ہیں جو معاشرے میں رائج ہیں لیکن ان کی کوئی بنیادی توجیہ نہیں ہے جیسے بعض چیزوں اور عدد ۱۳ کی نحوست وغیرہ جن کے کے بارے میں مختلف اقوام میں مختلف بدشگونیاں مشہور ہیں۔ ان بدشگونیوں کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ کہاں سے پیدا ہوئیں۔

لیکن جن باتوں کی جڑیں انسانی فطرت میں پھیلی ہوئی ہیں اور عقل و منطق پر مبنی مضبوط دلائل موجود ہیں ان کے بارے میں مفروضے قائم نہیں کیے جاتے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے:

خوف کی وجہ سے خدا کا تصور وجود میں نہیں آیا بلکہ خدا کی وجہ سے خوف آتا ہے۔ یعنی خدا کی نافرمانی سے خوف آتا ہے۔

۲۔ جہالت

قانون طبیعت کے تحت رونما ہونے والے حوادث کی طبعی توجیہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اللہ کا تصور وجود میں آیا۔

مثلاً جب زلزلے کی وجہ اور سبب معلوم نہیں تھا تو سمجھا گیا کہ کوئی طاقت ہے جو اتنی بڑی زمین

[1] قصة الحضارة ۱: ۹۹

کو ہلا دیتی ہے۔

جب بادلوں سے پانی برسا تو معلوم نہیں تھا کہ بادلوں سے پانی کیسے آتا ہے تو یہ سمجھا گیا کہ کوئی ذات ہے جو بادلوں سے پانی برساتی ہے۔

اس طرح وہ کہتے ہیں کہ سائنس ان حادثات کی نسبت مادی علل و اسباب سے دیتی ہے جب کہ اہل دین ان علل و اسباب سے واقف نہیں ہیں اس لیے وہ ایسی طاقت سے نسبت دیتے ہیں جسے وہ اللہ اور معبود بناتے ہیں۔

ایک مثال یہ دینا چاہوں گا کہ جب انسان کو پتہ نہ چلا کہ روئے زمین پر روح یعنی حیات کہاں سے آئی جب کہ حیات کا سرچشمہ حیات ہوتی ہے تو اس مجہول کی جگہ کچھ لوگوں نے اللہ کو رکھ دیا۔

جواب: ملحدین کے یہ نظریات خود جہالت پر مبنی ہیں۔ ملحدین کو سرے سے علم ہی نہیں کہ دین والے طبعی قانون اور اللہ تعالیٰ کے ارادے میں کسی تضاد کے قائل نہیں ہیں۔

دین والے اللہ کو قانون طبیعت کی جگہ نہیں رکھتے بلکہ طولاً دونوں کے قائل ہیں۔ اللہ کو خالق طبیعت، کائنات کا قانون ساز، نظام دہندہ، علت العلل اور مسبب الاسباب سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو سبب بنانے والا سمجھتے ہیں نہ یہ کہ اللہ کی جگہ سبب کو رکھتے ہیں کہ سبب کے انکشاف سے اللہ سے بے نیاز ہوا جائے۔

حدیث میں آیا ہے:

أبی اللہ أن یجری الاشیاء إلا بأسباب، فجعل لکل شیء سبباً۔[1]

اللہ کا اٹل فیصلہ ہے کہ چیزیں اسباب کے ذریعے ہی جاری کی جائیں۔ پھر ہر چیز کا سبب پیدا کیا۔

دین والے سبب کی جگہ اللہ نہیں رکھتے بلکہ علّت و سبب کے کامل نظام کائنات سے اللہ کے وجود کی دلیل قائم کرتے ہیں۔

۳۔ استحصال

بعض ملحدین کہتے ہیں کہ سرمایہ داروں اور مفاد پرستوں نے غریبوں کا استحصال کرنے کے لیے

[1] الکافي ۱: ۱۸۳

مذہب اختراع کیا ہے:

سرمایہ دار جب غلاموں، مزارعوں اور مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں اور وہ سرمایہ داروں کے خلاف آواز اٹھانا چاہتے ہیں تو سرمایہ داروں نے مذہب کے تصورات ایجاد کر کے انہیں صبر اور محنت و مشقت قبول کرنے پر آمادہ کیا۔

اس مقام پر لینن کہتے ہیں:

دین قوموں کے لیے افیون ہے۔

جواب: یہ نظریہ مارکسزم کے اس مشہور نظریے پر مبنی ہے کہ تمام نظریات اقتصادی عوامل کی پیداوار ہیں۔ وہ اس طرف سرے سے متوجہ نہیں ہوئے کہ ان کا یہی نظریہ بقول ان کے اس وقت کے اقتصادی عوامل کی پیداوار ہے اور عوامل بدلتے رہتے ہیں، انہیں سکون و دوام اور عینیت حاصل نہیں ہے۔ اس طرح ان کے اس نظریے کی بھی عینیت نہیں ہے اور یہ بدل گیا ہے۔

اس قسم کے تمام توہمات کا صریح جواب قرآن مجید میں موجود ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ کٰفِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾ [1]

اور ہم نے کسی بستی کی طرف کسی تنبیہ کرنے والے کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے مراعات یافتہ (عیاش) لوگ کہتے تھے جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَ کَذٰلِکَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ﴿۲۳﴾ [2]

اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی کی طرف کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے عیش پرستوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رسم پر پایا ہے اور انہی کی پیروی کر رہے ہیں۔

ان آیات میں تمام انبیاء (ع) کے بارے میں بلا استثنا یہ فرمایا کہ انبیاء (ع) کی دعوت عیش

[1] سورۃ سباء: ۳۴
[2] سورۃ الزخرف: ۲۳

پرستوں اور سرمایہ داروں نے مسترد کی ہے۔

درج ذیل آیت میں فرمایا کہ دعوت انبیاء (ع) کی غریبوں نے پذیرائی کی ہے۔ قدیم ترین نبی حضرت نوح (ع) کی قوم نے کہا:

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴿٢٧﴾[1]

ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: ہماری نظر میں تو تم صرف ہم جیسے بشر ہو اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے ادنیٰ درجے کے لوگ سطحی سوچ سے تمہاری پیروی کر رہے ہیں اور ہمیں کوئی ایسی بات بھی نظر نہیں آتی جس سے تمہیں ہم پر فضیلت حاصل ہو بلکہ ہم تو تمہیں کاذب خیال کرتے ہیں۔

۴۔ میراث گزشتگان

دین گزشتہ نسلوں کی میراث ہے۔ یعنی اس وقت لوگوں کے پاس جو دینی عقائد ہیں وہ قدیم انسانوں سے نئی نسلوں کو منتقل ہوئے ہیں۔

جواب: اس نظریے نے یہ نہیں بتایا کہ دین کی پیدائش کا سبب کیا ہے بلکہ یہ بتایا کہ دین قدیم انسانوں کے پاس تھا۔

اس سے اگر کوئی بات ثابت ہوتی ہے تو یہ ہے کہ دین انسان کے وجود کے ساتھ ساتھ رہا ہے اور یہ انسان کا لازمہ ہے۔ **پس دین فطرت کا تقاضا ہے۔**

دین اخلاقی ضرورت

سب کو علم ہے کہ انسان میں متضاد قوتیں موجود ہیں۔ جیسے شہوت، غصہ اور عقل۔ سب سے پہلے انسان میں خواہشات وجود میں آتی ہیں۔ چنانچہ انسان ابھی ماں کے شکم میں ہوتا ہے تو غذا کی خواہش ہوتی ہے اور جب وہ دنیا میں آتا ہے تو غصہ اس پر غالب آتا ہے جس کا وہ گریہ کر کے اظہار کرتا ہے۔ یہ دونوں قوتیں انسان میں پروان چڑھتی ہیں۔ ان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور سن بلوغ پہنچنے پر اس میں عقل آجاتی ہے۔ چنانچہ عقل کی قوت خواہشات کی قوت کے بعد آتی ہے۔

---

[1] سورة هود:٢٧

یہاں پہنچ کر یہ دونوں قوتیں انسانی نفس کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر خواہشات غالب آ جائیں تو انسان حیوانوں سے بدتر ہو جاتا ہے اور اگر عقل غالب آ جائے تو انسان فرشتہ صفت بن جاتا ہے۔

ان دونوں متضاد قوتوں کے درمیان کھڑے انسان کو عقل کے تقاضوں کی طرف لے جانے کی قوت مذہب فراہم کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کی سزا و جزا پر ایمان طاقتور ترین محرک ہے۔

تمام انسان بخوبی جانتے ہیں امانت، عدالت، عفت، سچائی اور وفا بعہد میں خوبی ہے۔ انسان کو ان قدروں کا مالک ہونا چاہیے۔

جب کہ خیانت، جھوٹ، عہد توڑنا، ظلم بری ہیں۔ دین ہی انسان میں اچھی باتوں کی ترغیب اور بری باتوں سے دوری اختیار کرنے کا محرک ہوتا ہے۔

دین نفسیاتی ضرورت

انسان کی روح آرزوؤں کی دوڑ میں محدودیت پر اکتفا نہیں کرتی حتیٰ کہ آرزو پوری ہو جائے تو بھی یہ دوڑ نہیں رکتی بلکہ مزید کی خواہش برقرار رہتی ہے۔ کسی چیز کے حصول سے پہلے اس کا بڑا شوق ہوتا ہے مگر حصول کے بعد اس کا شوق ختم ہو جاتا ہے۔ شوق ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ مزید کسی چیز کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح شوق کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور کسی ختم ہونے والی چیز کا شوق باقی نہیں رہتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدود چیز انسان کو اطمینان اور سکون نہیں دے سکتی۔ لہٰذا انسان کو لامحدود اور ختم نہ ہونے والی بات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے تاکہ اسے اطمینان اور سکون ملے اور وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ۔[1]

یاد رکھو! یاد خدا سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

ایمان اور معاشرہ

انسان اپنے ہم نوعوں کے ساتھ اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ وہ اپنے لوازم حیات میں دوسروں کا محتاج ہے چونکہ یہ سب کو کفایت کی حد تک میسر نہیں ہوتے جس طرح سانس لینے کے لیے ہوا سب کو کفایت کی حد تک میسر ہوتی ہے۔ دوسری طرف ضرورت اور لالچ انسان کو مفادت کے حصول میں

[1] سورۃ الرعد:۲۸

اقدام کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس سے اجتماعی عدالت کی ضرورت سامنے آتی ہے ورنہ معاشرے میں ناقابل تلافی فساد ہوتا ہے۔

اجتماعی عدالت قانون کے سائے میں فراہم ہوسکتی ہے۔ اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون کون بنائے؟

کہاجاتا ہے قانون بنانے کا کام پارلیمنٹ انجام دے سکتی ہے جیسا کہ آج کل مروج ہے مگر پارلیمنٹ سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔ اس کی چند وجوہات ہیں:

۱۔ پارلیمنٹ کےاراکین خواہ جاگیر دار ہوں یا سرمایہ دار، ان کے اپنے رجحانات اورمفادات ہوتے ہیں جو دوسروں سے مختلف ہیں۔ چنانچہ سب کے مشاہدے میں ہے کہ یہاں بننے والےقوانین ان رجحانات سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔

۲۔ پارلیمنٹ کےممبرز میں علمی، فکری صلاحیت نہیں ہوتی چونکہ ان کے پارلیمنٹ کےممبر بننے کے عوامل غیرعلمی وفکری ہوتے ہیں جیسے جماعتی، قبائلی، نژادی اور دیگر اثر ورسوخ کی بنیاد پر یہ لوگ پارلیمنٹ میں آتے ہیں۔

۳۔ پارلیمنٹ کےممبران حکومت، جماعت اور ووٹرز کے دباؤ میں ہوتے ہیں۔ وہ سب کے لیے عدالت پر مبنی قانون نہیں بنا سکتے۔

۴۔ اگر ہم مذکورہ بالا باتوں سے درگزربھی کریں، پھربھی کسی ملک کی پارلیمنٹ اپنے ملکی مفادات کے تحت قانون بنائے گی تمام معاشروں کے لیے یکساں عدل و انصاف کا قانون نہیں بنا سکتی۔

چنانچہ ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ امریکہ کو ویت نام، مشرق وسطی کے وحشیانہ قتل عام اور دنیا کے دیگر ملکوں میں جرائم کے ارتکاب کی سزا دی جا سکے جب کہ اپنے ملک میں واٹر گیٹ جیسی غیراہم خلاف ورزی پر امریکہ کے صدر کوسزا ملتی ہے اور اسے گھر جانا پڑتا ہے۔

۵۔ بفرض محال انسان اگر تمام انسانوں کے لیے عدل و انصاف فراہم کرنے کا قانون بنا بھی لے تو اس قانون کو خواہشات کے مارے معاشروں میں نافذ کرنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے جیسی ضمانت خدائی قانون میں موجود ہے۔

۶۔ اس قسم کے قانون کے نفاذ کے لیے ظاہری کردار کی نگرانی ہوسکتی ہے لیکن نفسیاتی اور اخلاقی

اوصاف اور انسانی قدروں پر مشتمل تہذیب و تربیت کی نگرانی ان قوانین میں نہیں ہے۔
لہٰذا قانون بنانے والا عالم اسرار اور خالق بشر ہوسکتا ہے اور اس قانون کا نفاذ متقی، متدین عادل افراد کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔

ایک اہم سوال

کیا ثابت، غیر متغیر دین، ایک متغیر انسان کی قانونی ضروریات پوری کرسکتا ہے؟
کچھ کم علم لوگوں کا خیال ہے کہ دین صرف اپنے خاص زمانے کے لیے قابل نفاذ ہے، ہر زمانے کے لیے نہیں۔ چونکہ دینی احکام ثابت ہیں اور قابل تغیر نہیں ہیں جب کہ انسان تحول وتغیر کی زد میں ہے۔ زمان و مکان کے اعتبار سے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا دونوں کو ثابت ہونا چاہیے یا دونوں کو متغیر۔ ایک ثابت کا متغیر کے ساتھ کیا جوڑ؟!

فقیہ بزرگ حضرت آیۃ اللہ محسنی دام ظلہ اپنی کتاب ''مباحث علمی دینی'' میں اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہاں ذکر کرتے ہیں۔

اس جواب کے دو حصے ہیں:

۱۔ انسان کی طبیعت ونفسیات کے اہم ترین حالات ثابت اور غیر متغیر ہیں۔

۲۔اسلامی احکام وقوانین کا ایک اہم حصہ متغیر اور متحرک ہے۔

لہٰذا اسلام کے ثابت احکام انسان کی ثابت شقوں اور متغیر احکام انسان کے متغیر حالات کے لیے ہیں۔

۱۱۔ ثابت قوانین

انسان کے بہت سے خصائل اور فطری تقاضے ثابت اور لا یتغیر ہیں۔ درج ذیل مثالوں پر توجہ دیجیے:

i۔ انسان اپنی اولاد، والدین اور رشتہ داروں سے محبت کرتا ہے۔

ii۔ بھوک اور پیاس کی صورت میں کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت کا احساس کرتا ہے۔

iii۔ دوست کے ساتھ محبت اور دشمن کے ساتھ عداوت رکھتا ہے۔

iv- احسان کی وجہ سے محبت اور برائی کی وجہ سے عداوت ہوتی ہے۔

v۔ سالم انسان ازدواج کی خواہش رکھتا ہے۔

vi۔ زن وشوہر اولاد کی خواہش رکھتے ہیں۔

vii۔ جمال پرست ہوتا ہے۔
viii۔ حب ذات، جذب منفعت اور دفع ضرر انسان کی جبلت میں ہے۔
ix۔ انسان کسی ضرورت کے تحت ہی قتل اور ظلم کا اقدام کرتا ہے۔
x۔ جب تک کوئی مانع نہ ہو اپنی خواہشات کو نہیں چھوڑتا۔
xi -انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ تمام مادی وسائل فراہم ہوں۔
xii۔ خواہش ہوتی ہے کہ سب اس کا احترام کریں اور اس کی تذلیل نہ کریں۔
xiii۔ خواہش ہوتی ہے محتاج، مریض، مظلوم، بدنام نہ ہو۔ لوگ اس کے فرمانبردار ہوں، سرداری ملے۔
xiv۔ غالباً اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے دوسروں کے مال وعزت پر تجاوز کرتا ہے۔
xv۔ مناسب موقع پر ریاکاری بری نہیں لگتی۔
xvi۔ علم وکمال پسند کرتا ہے۔
xvii۔ اسے پسند نہیں کہ اسے جاہل اور عیب دار کہا جائے۔
xviii۔ انسان خود پسندی اور خودخواہی کا شکار ہوتا ہے مگر یہ کہ اس کی عقلی قوت بہت زیادہ ہو۔
xix۔ غالباً لالچی، بخیل ہوتا ہے اور کبھی سخی اور قناعت پسند ہوتا ہے۔
xx۔ دوسروں پر برتری کا خواہشمند ہوتا ہے۔
xxi۔ موت اور نابودی کو ناپسند کرتا ہے مگر بعض نادر حالات میں موت قبول کرتا ہے۔
xxii۔ اپنی صحت اور نفسیاتی سکون کا خواہاں ہوتا ہے۔
xxiii۔ گندگی اور غلاظت سے نفرت ہوتی ہے۔
xxiv۔ بغیر زحمت کے منافع پسند کرتا ہے۔
xxv۔ سردی اور گرمی سے متاثر ہوتا ہے۔
xxvi۔ نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔
xxvii۔ انسان کا طریقہ تولید تبدیل نہیں ہوتا۔
xxviii۔ سنگین بوجھ اٹھانے سے تھک جاتا ہے۔
xxix۔ کوئی بچہ دانت اور داڑھی کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔

xxx۔کوئی بچہ کئی سال ماں کے شکم میں نہیں رہتا، نہ ہی چند روز میں پیدا ہوتا ہے۔
اس طرح بیسیوں دیگر باتیں ہیں جو ابتدائی انسان سے لے کر آج تک کے انسان میں ثابت اور لا یتغیر ہیں۔ البتہ مذکورہ چیزوں کی کیفیت میں تغیر وتبدل آتا ہے۔کھانے پینے، لباس کی کیفیت اور سفری وسائل میں تبدیلیاں ہو جاتی ہیں تاہم ان تبدیلیوں کا تعلق اس کے عارضی ماحول سے ہے خود انسانی طبیعت سے نہیں۔ مثلاً اپنا دفاع کرنا انسان کا ایک طبیعی امر ہے خواہ اپنے ہاتھ سے ہو یا ایٹمی ہتھیار سے۔

۲۔متحرک قوانین

احکام وقوانین اسلامی کی دو قسمیں ہیں: اولیٰ اور ثانوی:
ا۔اَوّلی قوانین وہ ہیں جو بذات خود موضوع سے متعلق ہیں اس موضوع پر ہونے والے عارضی حالات سے قطع نظر۔ جیسے شراب بذات خود حرام ہے۔
۲۔ثانوی قوانین اس موضوع پر ہونے والے عارضی حالات سے متعلق ہیں۔ جیسے اگر شراب پینے پر زندگی کا بچنا موقوف ہے تو حلال ہے۔
اس طرح متحرک قوانین کی تین قسمیں ہیں:
پہلی قسم۔ثانوی قوانین: جن کی تعریف کا ذکر ہو گیا کہ عارضی حالات کے مطابق مترتب ہونے والے قوانین کو ثانوی قوانین کہیں گے۔ وہ عارضی حالات جن کی وجہ سے قانون اور حکم بدل جاتا ہے حسب ذیل ہیں:
i۔ اضطراری حالت: اضطراری حالت میں بہت سی حرام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں۔فرمایا:
وَقَدۡ فَصَّلَ لَكُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَيۡهِ...۔[1]
حالانکہ اللہ نے جن چیزوں کو اضطراری حالت کے سوا تم پر حرام قرار دیا ہے ان کی تفصیل اس نے تمہیں بتا دی ہے۔
ii۔عسر و حرج: ایک واجب عمل انجام دینے میں معمول سے زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی ہے تو وہ حکم اٹھ جاتا ہے۔غسل کرنے میں عسر و حرج اور مشقت ہے تو غسل کا حکم اٹھ جاتا ہے اس کی جگہ تیمم کا حکم آتا ہے۔فرمایا:

[1] سورۃ الانعام:۱۱۹

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ....[1]

اور دین کے معاملے میں تمہیں کسی مشکل سے دوچار نہیں کیا۔

يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ....[2]

اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

iii۔ تقیہ: جان و مال کو خطرہ ہونے کی صورت میں بھی قانون میں لچک آ جاتی ہے۔فرمایا:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً....[3]

مومنوں کو چاہیے کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو سرپرست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، ہاں اگر تم ان (کے ظلم) سے بچنے کے لیے کوئی طرز عمل اختیار کرو۔

iv۔ضرر: کسی کو کسی چیز سے ضرر پہنچتا ہے تو اس کا حکم بدل جاتا ہے۔مثلاً اسلامی قوانین کے تحت انسان اپنے مال کا مالک ہے لیکن اس مال سے کسی کو ضرر پہنچتا ہے تو ملکیت کا حق سلب ہو جاتا ہے۔ حدیث نبوی ہے:

لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ فِی الْاِسْلَام۔[4]

اسلام میں نہ ضَرر اٹھانا ہے، نہ ضَرر پہنچانا۔

یعنی ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس سے ضرر اُٹھانا یا پہنچانا پڑے۔

v۔ جبر و اکراہ: کسی کی طرف سے مجبور کیے جانے کی صورت میں بھی حکم بدلتا ہے۔

vi۔ بیماری اور سفر میں روزے کا حکم بدلتا ہے۔

vii۔خوف میں حکم بدلتا ہے۔

viii۔ عاجز: عمل انجام دینے سے عاجز رہ جائے تو حکم بدل جاتا ہے۔

ix۔ جہالت: نہ جاننے سے حکم اٹھ جاتا ہے اگر نہ جاننا کوتاہی کی وجہ سے نہ ہو بلکہ ممکن نہ

[1] سورۃالحج:۷۸

[2] سورۃالبقرۃ:۱۸۵

[3] سورۃآل عمران:۲۸

[4] وسائل الشیعۃ ۲۶:۱۴

ہونے کی وجہ سے ہو۔ جسے جاہل قاصر کہتے ہیں۔

x۔ نذر، قسم،عهد کے ذریعے ایک جدید حکم دیا جا سکتا ہے۔

xi۔ دوحکموں میں تزاحم (ٹکراؤ) کی وجہ سے بہت سے احکام بدل جاتے ہیں۔کسی کے مال پر بلا اجازت تصرف کرنا جائز نہیں ہے لیکن اگر کسی مومن کی جان بچانا اس تصرف پر موقوف ہوتو جائز ہے۔

xii۔ جامع الشرائط مکلف موجود نہ ہونے کی وجہ سے واجب کفائی، عینی میں بدل جاتا ہے۔

دیگر بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے احکام بدل جاتے ہیں۔ البتہ جب عارضی حالت ختم ہو جاتی ہے توحکم اَوّلی واپس آ جاتا ہے۔

دوسری قسم: متحرک قوانین کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی موضوع کے بارے میں شریعت خاموش ہے۔ اسے فقہاء منطقة الفراغ کا نام دیتے ہیں۔ جہاں انسان خود اجتماعی طور پر شوریٰ کے ذریعے یا انفرادی طور پر قانون بنانے میں آزاد ہیں۔ جیسے ٹریفک کے قوانین ہیں۔ ان میں دیگر اسلامی قوانین سے تصادم نہ ہونے کی صورت میں انسان خود قانون بنا سکتے ہیں۔

تیسری قسم: متحرک قوانین کی تیسری قسم یہ ہے کہ حکومت اسلامی میں حاکم ملکی مصلحت کے تحت فقہ اسلامی کے دائرے میں رہ کر ہنگامی قانون نافذ کرتا ہے اور کبھی بعض دیگر اسلامی قوانین کو وقتی طور پر متوقف کر دیا جاتا ہے۔

امید ہے محترم قارئین پر واضح ہوگیا ہوگا کہ اسلامی شریعت کس طرح ہر زمانے کے تقاضے پورے کرتی ہے اور ہر عصر کا ایک جامع قابل عمل نظام فراہم کرتی ہے۔

ایمان کے اثرات

انسان کے ایمان کے اثرات کا سب سے پہلا اثر یہ ہے کہ اس سے سکون اور تسلی میسر آتی ہے اور عالم خلقت اور وجود کے بارے میں بہتر توجیہ ملتی ہے کہ یہ کائنات بلاوجہ وجود میں نہیں آئی۔ اس کا کوئی ہدف ہے۔ اس میں ارتقا اور سعادت ہے۔ انسان محض ایک بے مقصد کیڑا اور نیچر کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں ہے:

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا۔[1]

اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اسے ایک تنگ زندگی نصیب ہو گی۔

[1] سورة طٰہٰ:۱۲۴

ا۔ ایمان انسان کو مقصد و راز زندگی عنایت کرتا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی پر امید ہو جاتی ہے جب کہ ایمان کے بغیر انسان نیچر کے ہاتھوں میں ایک بے مقصد کھلونا ہے۔

۲۔ ایمان سے زندگی لذیذ اور تلخی دور ہوتی ہے۔

واضح رہے انسان اپنے وجود کے تمام زاویوں سے ماورا ایک شعور رکھتا ہے۔ یہ شعور اپنے خالق سے مانوس ہوتا ہے۔ جس ہستی نے اس کی ساخت و باخت کی تاریں جوڑی ہیں اس کا جس قدر قرب حاصل ہو اسی قدر اس کے شعور کو سکون و سرور ملتا ہے اور اس سے جدائی و دوری کی صورت میں یہ بے سکون ہو جاتا ہے خواہ دنیا کی ساری دولت اور حکومت اسے میسر آ جائے۔

اس سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ انسان صرف اس دنیا کی زندگی کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے اس دنیا کی ریل پیل سے اس کا جی نہیں بھرتا بلکہ وہ مزید بے سکون ہو جاتا ہے۔ اگر انسان صرف اسی دنیاوی زندگی کے لیے پیدا ہوا ہوتا تو اس دنیا کی رعنائیوں سے اسے اسی طرح سکون ملنا چاہیے تھا جس طرح مچھلی کو پانی میں سکون ملتا ہے۔

ایمان روح کی روشنی ہے جس سے اسے بہت سے حقائق نظر آتے ہیں۔ جب کہ وہ شخص جو ایمان نہیں رکھتا، ایک بے مقصد تاریکی میں سرگرداں رہتا ہے۔

ایمان سے زندگی پر امید ہوتی ہے اور اپنی کوششوں اور اعمال کا نتیجہ دیکھنے کی امید میں ہوتا ہے۔ جس طرح ایک طالب علم اپنی محنتوں کا نتیجہ دیکھنے کی امید کی شیرینی میں اچھا وقت گزارتا ہے۔

ایمان کے مثبت اثرات میں سے ایک اہم اثر لذت معنوی ہے۔ لذت کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ لذت مادی جو اپنے حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ جیسے آنکھ، دہن، کان وغیرہ کسی عضو سے مربوط لذت ہے۔

۲۔ دوسری لذت کسی عضو سے نہیں بلکہ پورے وجود سے مربوط ہوتی ہے۔ جیسے کسی پر احسان کرنے اور کسی مہم میں کامیابی کی لذت ہے اور عبادت کی لذت بھی اسی قسم سے ہے جو تمام لذتوں سے زیادہ اہم ہے۔

مشہور جرمن فلاسفر کانٹ (ImmanuelKant) کہتے ہیں:

دو چیزوں نے انسان کو تعجب سے دوچار کیا ہے۔ ایک ہمارے سروں کے اوپر ستاروں

سے بھرا آسمان۔ دوسری ہمارے باطن میں موجود ضمیر و وجدان۔[1]

کہتے ہیں: یہ عبارت اس کی قبر پر کندہ ہے۔

حوادث کا مقابلہ

انسانی زندگی ہمیشہ کامیابیوں سے عبارت نہیں ہے۔ بعض اوقات ناکامیوں سے بھی دوچار ہوتی ہے اور بڑھاپے میں بھی انسان مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ بقول اقبال

جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

ایسے حالات میں ایمان ہے جو اس کمزور انسان کو سہارا دیتا ہے اور عبادت گزار بوڑھے کو عبادت میں جو سکون ملتا ہے وہ جوان کو حاصل نہیں ہے۔

اس لیے ماہرین کا موقف درست ہے کہ اس زمانے میں نفسیاتی بے چینی پر مبنی امراض سب سے زیادہ ہیں۔

علم اور ایمان

علم اور ایمان جدا کرنے کا ضرر ناقابل تلافی ہے۔ ایمان علم کی روشنی میں لانا چاہیے۔

اگر علم کے بغیر ایمان ہو تو یہ نام نہاد مومن منافقین کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ جیسا کہ صدر اسلام میں مدینہ کے منافقین اور خوارج تھے اور آج (۲۰۱۷ء) کے زمانے میں طالبان، القاعدہ اور داعش کو دیکھ رہے ہیں۔

ایمان کے بغیر علم نشئی کے ہاتھ میں تلوار اور چور کے ہاتھ میں چراغ کی مانند ہے۔ چنانچہ ایمان کے بغیر عالم، علم کے بغیر ایمان والے سے مختلف نہیں ہے۔

جارج سارٹن (George Sarton) اعتراف کرتے ہیں کہ ایمان سے مراد دینی ایمان ہے اور انسان فن، دین اور علم کا محتاج ہے۔

کہتے ہیں: فن سے جمالیات ظہور پذیر ہوتی ہیں اور زندگی میں مسرت کا باعث بنتی ہیں۔ دین محبت پیدا کرتا ہے۔ علم حق، سچائی اور عقل کا باعث بنتا ہے اور انسان ہوش مند بن جاتا ہے۔ ہمیں ان تین چیزوں کی ضرورت ہے۔

---

[1] سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ...۔ (سورۃ فصلت:۳۵) ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی...۔

علم اور ایمان ناقابل تفریق ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے لازم ہے۔ چنانچہ علم وسائنس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ایمان کی جگہ لے اور ہمیں زندگی کے اصل مقصد تک رسائی دے۔ نہ ایمان علم کی جگہ لے سکتا ہے اور نہ علم کے بغیر ایمان سے ہم اپنے نفس اور دنیا پر حاکم قوانین کو پہچان سکتے ہیں۔

علم کے بغیر ایمان اندھی تقلید، تعصب اور خرافات ہے۔ جیسا کہ ہم آج کل (۲۰۱۷ء) دہشت گردی دیکھ رہے ہیں۔ علم کے بغیر ایمان والے استعمار کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ انہیں شعور نہیں ہوتا کہ کس کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔

ایمان کے بغیر علم ایک درندے کے ہاتھ میں موجود طاقت کی طرح ہے۔ کسی نے کہا تھا:

مجھے بیل سے خوف آتا ہے کیونکہ اس کے پاس سینگ ہیں، عقل نہیں ہے۔

چنانچہ آج کے بے ایمان دانشمند اور کل کے بے علم ایماندار میں تھوڑا فرق ہے۔ کل کے فرعون اور آج کے استعمار میں فرق دیکھا جائے تو آج کا تعلیم یافتہ بے ایمان، طاقتور استعمار، کل کے جاہل ایماندار سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا ہے۔

دو عبرتناک خطوط

موصل عراق کے گورنر کو ہلاکو کی طرف سے خط ملا جس میں لکھا تھا:

موصل کا گورنر اگر جنگی ساز و سامان اور بغداد کے عظیم قلعہ کی فتح کا وسیلہ اسے فراہم کرے تو وہ موصل کا محاصرہ ختم کر دے گا۔

اسی وقت اسے خلیفہ عباسی کا بھی ایک خط ملا جس میں لکھا تھا:

گورنر صاحب! موصل کے اچھے فنکار خلیفہ کے ہاں بھیجیں تا کہ خلیفہ کی عیش و طرب کی محفل کی رونق دوبالا ہو جائے۔[۱]

بے علم ایمان نے خوارج، القاعدہ، داعش اور طالبان جیسے خونخوار پیدا کیے جو کسی بھی انسانی قدر سے آشنا نہیں ہیں۔

بے ایمان علم نے دنیا کو آتشیں بنا دیا۔ پہلی اور دوسرے جنگ عظیم، ہیروشیما پر ایٹمی حملہ، ویتنام اور مشرق وسطی میں لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دینا وغیرہ۔

[۱] المقابیس۔ تالیف احمد بن فارس بن زکریا ج ۲ طبع مصر

راز حیات

انسان اگر ایمان کی روح سے محروم ہے تو اس سے اگر سرّ حیات اور راز زندگی کے بارے میں سوال کیا جائے کہ تو کہاں سے آیا؟ کہاں جانا ہے؟ کیوں آیا؟ کس لیے زندہ ہو؟ تیری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ زندگی میں پیش آنے والی نشیب و فراز کا کیا فلسفہ ہے؟ زندگی میں پیش آنے والے مصائب وآلام کس لیے؟ بیماریوں، محرومیوں میں کیا راز ہے؟

مادی سوچ کے حامل انسان کے پاس کوئی توجیہ، کوئی جواز، کوئی فلسفہ اور کوئی راز موجود نہیں ہو گا۔ وہ بس یہ کہہ سکتا ہے:

> میں طبیعت کے ہاتھوں ایک کھلونا ہوں۔ وہ مجھے درد دکھ دیتی ہے۔ بلا مقصد آیا ہوں۔ بے مقصد نابود ہوجاؤں گا۔ بے مقصد کیڑا ہوں۔ زندگی موت کا کوئی فلسفہ نہیں۔
>
> ایمان کی قوت سے محروم کھوکھلا انسان:
>
> الف: زندگی کی صحیح سمجھ نہ آنے کی وجہ سے،
>
> :ب مادی لذتوں کی گندگی میں ملوث ہونے کی وجہ سے،
>
> ج: زندگی کے ناملائم حالات سے دوچار ہونے کی وجہ سے،
>
> اور
>
> د: مرنے کے بعد نابود ہونے کے تصور کی وجہ سے
>
> نفسیاتی اضطراب اور بے مقصد پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے:
>
> وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا۔[1]
>
> اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اسے یقیناً ایک تنگ زندگی نصیب ہو گی۔
>
> وَمَنۡ يُّعۡرِضۡ عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّهٖ يَسۡلُكۡهُ عَذَابًا صَعَدًا۔[2]
>
> اور جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے منہ پھیرے گا وہ اسے سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔

اس قسم کے لوگ یا تو منشیات کے ذریعے وقت گزارتے ہیں یا خودکشی کرتے ہیں۔ جب کہ

---

[1] سورة طٰہٰ:۱۲۴

[2] سورة جن:۱۷

ایمانی قوت والے سکون اور اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ مومن اپنی زندگی کا مقصد رکھتا ہے اور وہ ہے ارتقا اور حصول کمال۔ اگر وہ مصائب و آلام سے دو چار ہوتا ہے تو بھی اس کے لیے آخرت کے مثبت اثرات ہیں۔ اگر کسی مقصد میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو بھی مطمئن ہوتا ہے کہ اسی میں اس کی مصلحت ہے۔

لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔[1]

جب وہ ایمان لائے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ان سے ٹال دیا۔

سائنسی علوم اور دین

آج سائنسی دنیا جس مرحلے میں ہے اس کے تحت دین مسترد نہیں ہوسکتا۔ سائنس معترف ہے کہ نہ صرف دین سائنس کے دائرہ کار میں آتا ہے بلکہ بعض سائنسی پیشرفتوں کی بنیاد پر سائنس دین سے معانقہ کرتی نظر آتی ہے۔ خصوصاً طبیعاتی اور انسانی دماغ کی کارکردگی کے انکشافات بلکہ جدید تحقیقات کے نتیجے میں مادیت کا ڈھانچہ منہدم ہو گیا ہے اور کائنات پر روح اور عقل کی حاکمیت کا انکشاف ہو رہا ہے۔ چنانچہ بعض سائنسدان کہتے ہیں: کائنات کی انتہا عقل پر جا کر رک جاتی ہے اور بعض دیگر سائنسدان کہتے ہیں: کائنات کا اصل مواد، عقلی مواد ہے۔[2]

تازہ ترین انکشافات سے سامنے آنے والے حقائق میں بتایا گیا ہے کہ مادے کے مقابلے میں غیر مادی طاقت برابر کی ہے۔ چنانچہ جتنے الیکٹران، پروٹون اور نیوٹرون یا کوئی کائناتی جسم ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اتنی ہی غیر مادی طاقت بھی کارفرما ہوتی ہے۔[3]

ڈاکٹر البرٹ آئن اسٹائن تو ایمان سے محروم شخص کو زندہ تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں:

ہر وہ شخص جو قدرت کے معجزات سے متاثر نہیں ہوتا اور ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہے وہ ایک مردہ شخص ہے۔

[1] سورة يونس:۹۸
[2] مدخل إلى موقف القران من العلم۔
[3] ایضاً

کائنات

ہم سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی تو اس کے تین احتمالات بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ از خود پیدا ہوئی ہے۔

۲۔ کائنات ازلی ہے۔ اس کی کوئی ابتدا نہیں ہے۔

۳۔ اس کا کوئی خالق ہے۔

۱۔ کائنات کا از خود پیدا ہونا ناقابل تصور ہے۔ اس کے بطلان پر دلیل قائم کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ آگے چل کر مصادفہ اور اتفاقیہ کے بطلان پر ناقابل تردید دلیل قائم کریں گے۔

۲۔ دوسرا نظریہ کہ کائنات قدیم ہے جس کی کوئی ابتدا نہیں ہے۔ یہ بھی قابل قبول نہیں ہے چونکہ آج سب پر روشن ہے کہ کائنات قدیم نہیں۔ اس کی ابتداء ہے اور ڈائنامک حرارت (Dynamic Heat) کے قوانین کے مطابق اس کائنات میں حرارت تدریجاً کم ہو رہی ہے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ یہ حرارت صفر تک پہنچ جائے گی۔ یہ پوری کائنات سکوت و جمود کے عالم میں گم ہو جائے گی اور حیات و زندگی ناپید ہو جائے گی۔ اگر کائنات ازلی ہوتی تو کب کی سکوت و موت کے عالم میں گم ہو چکی ہوتی۔

سائنسدان صرف یہ نہیں کہتے کہ کائنات ازلی نہیں ہے بلکہ وہ کہتے ہیں:

کائنات دفعتاً وجود میں آئی ہے۔

اس جگہ سر جیمس (Sir james) کہتے ہیں:

جدید سائنس کا اس پر ایمان ہے کہ تغیر حرارت کا عمل تمام انرجی ختم ہونے تک جاری رہے گا۔ ابھی یہ اپنے آخری مرحلے میں داخل نہیں ہوا ورنہ آج ہم یہاں موجود نہ ہوتے۔

جب کائنات ابدی نہیں ہے تو تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے۔

۳۔ اس کائنات کا کوئی خالق ہے۔ جو قدیم ہے اور اس کی کوئی ابتداء نہیں ہے۔

آج سب پر واضح ہے کہ اجرام سماوی ایک دوسرے سے بڑی تیزی سے دور ہو رہے ہیں اور کائنات ہر آن حالت وسعت میں ہے۔

سائنس کے ایک مفروضے کے مطابق کائنات آج سے ۱۵ ملیارد سال پہلے سوئی کے ناکے کے برابر ایک نقطے سے عبارت تھی۔ اس نقطہ کے پھیلنے سے کائنات وجود میں آ گئی۔ یہ نقطہ سائنسی مفروضے کے مطابق بگ بینگ (Big bang) سے پھٹا اور اس عظیم دھماکے کی وجہ سے یہ نقطہ پھیل کر کائنات کی تعمیر کی بنیاد بن گیا۔

ہمارے ہاں دھماکے سے تباہی مچتی ہے لیکن اس دھماکے سے کائنات تعمیر ہو گئی۔ یہ دھماکہ تعمیری دھماکہ تھا۔ ہمارے اٹیم بم کی طرح تخریبی دھماکہ نہ تھا۔

کہتے ہیں:

کائنات اتفاقاً وجود میں آئی۔ کسی قصد و شعور کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔

ہم کہتے ہیں:

اگر کسی ریتلے میدان میں دھماکہ ہو جائے تو کیا فضا میں ریت کے ذرات اڑنے سے کیا ایک عظیم قلعہ بن جائے گا؟ اگر کوئی ایسا کہے تو اسے کوئی عاقل نہیں کہیں ہے۔ البتہ موجود چیزوں میں دھماکہ ہو تو تباہی ہو گی لیکن ایجاد کے لیے کیے جانے والے دھماکے سے تعمیر ہو گی؟[1]

حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا:

ان اللہ کان اذ لا کان فخلق الکان و المکان۔[2]

اللہ تعالیٰ ہی تھا جب کوئی (زمانہ) بھی نہ تھا پھر اللہ نے زمان و مکان کو خلق کیا۔

کچھ لوگ آیہ:

اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا...۔[3]

کیا کفار اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ یہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کر دیا ہے....۔

[1] "رحلۃ فی الکون" از یحییٰ ہارون سے اقتباس
[2] الکافی ۱:۴۴۱
[3] سورۃ الانبیاء:۳۰

کی تطبیق مفروضہ دھماکے پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سائنسی مفروضوں پر قرآن کی تطبیق کرنا ایک خطرناک غلطی ہے۔

قابل مشاہدہ کائنات میں تقریباً دو کھرب سے زیادہ کہکشائیں ہیں۔ دیگر اندازوں کے مطابق چار کھرب کہکشائیں بتائی جاتی ہیں۔

یہ کہکشائیں ارب ہا ارب ستاروں کی عظیم الشان مملکتیں ہیں۔ ہماری کہکشاں کی عمر ایک مفروضے کے مطابق تقریباً بارہ ارب سال ہے۔

ہر کہکشاں ستاروں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ایک اوسط کہکشاں میں تقریباً ایک کھرب ستارے ہیں۔ ہر ستارہ سورج ہے۔ ہمارے کہکشاں میں بھی ارب ہا ارب ستارے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے سیارے اور چاند ہیں۔ یعنی ہمارے نظام شمسی جیسے اربوں نظام شمسی ہماری کہکشاں میں موجود ہیں۔

کہکشاؤں کی ساخت ایک جیسی نہیں ہے۔ کچھ بیضوی، کچھ چھلے اور کچھ مرغولہ نما ہیں۔ کچھ کہکشاؤں کی روشنی سنہری مائل ہے۔ کچھ کا مرکز نہایت بڑا ہے۔ ان کا نظارہ بڑا شاندار ہے۔

ہم زمین پر فاصلے میلوں میں طے کرتے ہیں مگر خلا میں فاصلہ نوری سال میں دیکھا جاتا ہے۔ ساٹھ کھرب میل کی مسافت ایک نوری سال ہے۔ چنانچہ ہماری کہکشاں کا مرکز ہم سے پچیس ہزار نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ ساٹھ کھرب کو پچیس ہزار سے ضرب دیں۔

یہ اسی کہکشاں کی بات ہے جس پر ہم رہ رہے ہیں۔

ایک عظیم الشان کہکشاں کی جسامت کل کائناتی کہکشاؤں میں صحرا میں ریت کے ایک ذرے سے زیادہ نہیں ہے۔

اس کہکشاں جسے عربی میں المرأة السلسة کہتے ہیں کی چوڑائی دو لاکھ نوری سال ہے۔

اب تک منکشف ہونے والی سب سے بڑی کہکشاں ہمارے کہکشاں سے ساٹھ گنا بڑی ہے۔

سبحان الله العظیم۔

آج ماہرین فلکیات بخوبی جانتے ہیں کہ کہکشائیں ستاروں سے تشکیل پاتی اور کہکشانی جھرمٹ تشکیل دیتی ہیں۔ یہ کہکشانی جھرمٹ بھی باہم منظم اور مربوط ہو کر جھرمٹوں کے جھرمٹ جنم دیتے ہیں۔

کہکشائیں شروع میں گیس اور گرد کے بے ہنگم مجموعے تھے مگر آج کہکشائیں بڑی منظم اور ترتیب وار حالت میں ہیں۔ قوت ثقل نے ستاروں کی بے ترتیبی ختم کر کے ان میں سے کچھ کو مرغولہ نما اور

کچھ کو دوسرے شکل دے دی ہے۔ کہکشاں کی ساخت اور اس کا مقدر بھی قوت ثقل کے ہاتھ میں ہے۔ قوت ثقل نا قابل یقین حد تک طاقتور ہے اور اس کا اصل منبع کہکشاں کے مرکز میں ہوتا ہے۔

اگرچہ کہکشائیں ایک دوسرے سے مختلف لگتی ہیں لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک ہے کہ یہ سب کی سب اپنے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہی ہیں۔

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا(University of California) اور یونیورسٹی آف ہوائی (University of Hawaii) کے ماہرین کے مطابق پانچ میں سے ایک ستارے کے ساتھ ہماری زمین کی طرح زندگی کے لیے سازگار سیارہ موجود ہے۔

ماہرین فلکیات نے مشاہدہ کیا ہے کہ مرکز کے قریب ستارے کئی لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگا رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب لیا گیا کہ مرکز میں ایک طاقتور ثقل موجود ہے جسے بلیک ہول (black hole) کا نام دیا گیا۔ یہ مفروضہ اس لیے قائم کیا گیا کہ کہکشاں کے ستاروں کے آپس میں مربوط رہنے کے لیے موجودہ کشش ثقل کافی نہیں ہے۔ اگر مرکز میں یہ بلیک ہول نہ ہوتو ستاروں کو بکھرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کشش ثقل کے لیے مفروضہ بلیک ہول بھی ناکافی ہے اور یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ پھر کس چیز نے ان کہکشاؤں کو سنبھالا ہوا ہے؟ کہتے ہیں: ایک نامرئی قوت ثقل موجودہ ہونی چاہیے جسے ماہرین فلکیات ''تاریک مادہ'' (Dark Matter) کا نام دیتے ہیں۔

اگر کہکشاؤں میں موجود ستاروں کو آپس میں مربوط رکھنے کے لیے موجودہ کشش ثقل ناکافی ہے اس لیے ایک ''بلیک ہول'' کی تھیوری قائم کی گئی مگر دیکھا کہ اس مفروضے ''بلیک ہول'' میں موجود مفروضہ کشش ثقل بھی ناکافی ہے اس لیے کشش کے لیے ایک اور سرچشمہ تلاش کیا گیا۔ نہ ملا تو ایک اور مفروضہ قائم کیا گیا اور اسے ''تاریک مادہ'' کا نام دیا گیا۔ ڈاکٹر عطاء الرحمن لکھتے ہیں:

> کہکشاں جس میں تمام ستارے، سیارے ثقب اسود (black hole) موجود ہیں وہ پوری کائنات کا صرف پانچ فیصد وزن ہیں باقی پچانوے فیصد کا وزن کہاں سے آتا ہے؟ یہ بہت بڑا راز ہے، اسے ''سیاہ توانائی''(Darkenergy) اور سیاہ وزن (Dark weight) کہتے ہیں۔ کشش ثقل کی لہریں شاید ایک دن یہ راز افشا کریں گی کیونکہ کائنات کا بیشتر حصہ پوشیدہ ہے اور اس کے پیچھے کون سے

حقائق ہیں، یہ ہمیں پتہ نہیں۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں موجود ستاروں کی حرارت رو بہ زوال ہے۔ ستارے اگر ازل سے ہوتے تو اب تک ساری کائنات سرد خانے میں تبدیل ہو چکی ہوتی۔ پس اگر کائنات کی ابتداء ہے تو اسے عدم سے وجود میں لانے میں کس قدرت کا دخل ہے؟ کیا اس کے وجود میں آنے میں اتفاق کا دخل ہے؟ یا یہ تقاضائے طبیعت کی وجہ سے ہے؟

ظاہر ہے جو چیز سرے سے موجود نہیں ہے وہ اتفاقاً کیسے وجود میں آ سکتی ہے اور جو طبیعت موجود نہیں ہے اس کے کوئی تقاضے ہو سکتے ہیں؟ فَمَا لَكُمْ ۗ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔[2]

کائنات کی ابتداء ہے۔ یعنی عدم سے وجود میں آئی ہے۔ کیا عدم سے وجود میں آنے سے پہلے، دوسرے لفظوں میں اس عظیم دھماکے سے پہلے "طبیعت" (نیچر) موجود تھی یا نہیں؟ اگر موجود تھی تو دھماکے سے کیا وجود میں آیا؟ اور اگر طبیعت موجود نہ تھی تو کائنات اس طبیعی انتخاب یا تقاضائے طبیعت سے کیسے وجود میں آ سکتی ہے جو سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

کائنات کی ابتدا و انتہا مربوط ہے

اس کائنات میں ہماری کہکشاں کی حیثیت، جس کا پھیلاؤ ہزاروں نوری سال پر مشتمل ہے، سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہے لیکن کائنات میں موجود بڑی سے بڑی کہکشاں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ایٹم کے ذرے تک ہر چیز فانی ہے۔

سائنسدانوں کا کہنا ہے: ہم نے ابھی تک چیز ایسی نہیں دیکھی جو لافانی ہو۔ ابدیت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ زمان و مکان بھی ایک دن ختم ہو جائیں گے۔

کائنات ایک ایسی تنی ہوئی رسی پر کھڑی ہے جسے سکڑاؤ اور پھیلاؤ نے تھاما ہوا ہے مگر یہ توازن اس وقت تک قائم رہے گا جب تک توانائی موجود ہے۔

کہتے ہیں: کائنات کے اربوں سال سے قائم رہنے کا سہرا دو مخالف قوتوں یعنی پھیلاؤ اور قوت ثقل کے سر ہے مگر یہ توازن کس حد تک پائیدار ہے؟ کیا کائنات میں اس قدر مادہ موجود ہے جو اس بے قابو پھیلاؤ کو جاری رکھ سکے۔

سائنسدانوں کا کہنا ہے: کائنات کی تخلیق کا سب سے اہم لمحہ تخلیق کا پہلا سکینڈ تھا۔ اس پہلے

---

[1] ڈاکٹر عطاء الرحمن۔ روزنامہ جنگ

[2] سورۃ یونس: ۳۵ (ترجمہ) تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کر رہے ہو؟

سیکنڈ میں زمان و مکان سے لے کر مادہ اور توانائی، ہر چیز کا تعین ہو گیا تھا۔ اس پہلے سکینڈ میں اتنی چیزیں وقوع پذیر ہوئی تھیں جتنی آنے والی کائنات کی تاریخ میں بھی ہوں گی۔ کائنات میں نظر آنے والی تمام رعنائیاں اس پہلے سیکنڈ میں وجود میں آئی ہیں۔

مگر یہ سب ہوا کیسے ہے؟ اسے ابھی تک ماہرین طبیعت نہیں سمجھ سکے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ عظیم دھماکہ کیوں ہوا؟ نہ اس کی خبر رکھتے ہے کہ کیا پھٹا تھا؟ جو بات سائنسدان یقین سے کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے: ہر چیز دھماکے سے یکدم وجود میں آ گئی۔

کہتے ہیں: ہر وہ چیز جو آج قابل مشاہدۂ کائنات ہے، سینکڑوں ارب کہکشائیں ہیں، ان میں کئی ارب ستارے ہیں، یہ سارا مادہ جس کا ادراک کرنا انسانی فہم سے کہیں بلند ہے ایک ایسی جگہ سکڑا ہوا تھا جو لامحدود طور پر چھوٹی تھی۔ (صفحۂ عدم میں تھا کی ایک تعبیر)

بقول سائنسدان اس دھماکے کے بعد زمان و مکان وجود میں آئے ہیں تو دھماکے کے لیے زمان کا تصور درست نہیں ہو گا بلکہ یہ دھماکہ زمانے سے ماورا ہے۔

قابل توجہ حدیث ہے:

ان الله كان اذ لا كان فخلق الكان والمكان۔[1]

اللہ تعالیٰ ہی تھا جب کہ تھا (زمانہ) بھی نہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے زمان و مکان بنایا۔

نیز حدیث میں ہے:

اما من الله فارادته احداثه لا غير ذلك لانه لا يروّي ولا يهم ولا يتفكر ... يقول: كن فيكون بلا لفظ ولا نطق بلسان ولاهمة ولا تفكر ولا كيف لذلك كما انه لا كيف له۔[2]

ایجاد صرف اللہ کے ارادے سے عبارت ہے۔ اس میں سوچنا ہے نہ تصور کرنا اور نہ غور کرنا...۔ اللہ کے کن فیکون کا مطلب زبان سے تلفظ کرنا ہے نہ فکر و غور کرنا اور نہ کسی خاص کیفیت کے ساتھ ہونا ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کی ذات کسی کیفیت میں نہیں ہے۔

[1] الکافی ۱: ۴۴۱

[2] الکافي ۱: ۱۰۹

امیر المؤمنین علیہ السلام سے مروی ہے:

وانه سبحانه يعود بعد فناء الدنيا وحده لا شيء معه كما كان قبل ابتدائها كذلك يكون بعد فنائها۔ بلاوقت ولا مكان ولا حين ولا زمان عدمت عند ذلك الاجال والاوقات وزالت السنون والساعات۔[1]

بلاشبہ اللہ سبحانہ دنیا کے مٹ جانے کے بعد ایک اکیلا ہو گا۔ کوئی چیز اس کے ساتھ نہ ہو گی جس طرح دنیا کی ایجاد و آفرینش سے پہلے تھا یونہی اس کے فنا ہو جانے کے بعد بغیر وقت و مکان اور ہنگام و زمان کے ہو گا۔ اس وقت مدتیں، اوقات، سال اور ساعتیں سب نابود ہو جائیں گی۔

کہتے ہیں: کائنات کی تخلیق کے پہلے سکینڈ میں جتنی ارتقا ہوئی ہے وہ اس وقت سے لے کر اس کے انجام تک ہونے والی ارتقاء سے کہیں زیادہ تھی۔

یہ سب اس قدر تیزی سے واقع ہوا تھا کہ سائنس دانوں کو اس پہلے سکینڈ کو سمجھنے کے لیے وقت کی ایک نئی اکائی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ ہم اپنی زندگیاں، گھنٹوں، منٹوں اور سکینڈوں میں ناپتے ہیں مگر وقت کے پیمانے، وقتِ تخلیق کے پیمانوں کے سامنے بیکار ہیں کیونکہ بگ بینگ (Big Bang) میں کائنات یکدم وجود میں آ گئی تھی۔ ہم نے کائنات کی تخلیق سے متعلق اپنی سمجھ بوجھ سکینڈ کے دسویں، سینکڑویں، کروڑویں، اربویں حصے یا اس سے پہلے اس حصے، جہاں طبیعات کے مروجہ قوانین کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، سے لی ہے۔

اتنا دور جانے کے لیے وقت کو ناقابل تصور چھوٹے یونٹوں میں بانٹنا ہو گا جس کا نام سائنس دانوں نے پلانك کا وقت (Planck time) رکھا ہے۔ ایک سیکنڈ میں ارب ارب ارب ارب پلانك کا وقت ہوتا ہے۔

کہتے ہیں: بگ بینگ خلا میں ہونے والا کوئی دھماکہ نہیں تھا بلکہ اس دھماکے کے نتیجے میں خلا وجود میں آئی تھی۔

کچھ سائنسدان سمجھتے ہیں کہ تخلیق کے اس اول وقت اور فوری عمل میں ایک زبردست طاقت کائنات کی ہر چیز پر حکمرانی کر رہی تھی۔

[1] الکافي ۱: ۱۰۹

سائنسدانوں کے مطابق ابتدائی کائنات ایک بے عیب اور بے نقص ہونے کا کامل نمونہ تھی۔ ایک واحد اور اکیلے بگ بینگ کے ساتھ موجود تھی۔ اس قوت کے اعتدال اور توازن نے کائنات پیدا کی اور قائم رہی ہے۔

کہتے ہیں: کائنات متوازن انداز میں پھیلی جس کے نتیجے میں ڈی این اے اور زندگی کی تخلیق ممکن ہوسکی۔

واضح رہے بلیک ہول (blackhole) ایک سائنسی تھیوری ہے۔اس مفروضے کی بنیاد پر تحقیقات جاری ہیں۔

کہتے ہیں: حال ہی میں ایک بلیک ہول ہماری اپنی کہکشاں ''ملکی وے'' (Milky Way) کے مرکز میں حتمی طور پر دریافت کیا گیا ہے۔اس کہکشاں کے مرکز کے عین قلب میں ایک بلیک ہول موجود ہے جس کی کمیّت سورج کے مقابلے میں پچیس لاکھ گنا زیادہ ہے۔

قرآن مجید میں سورة التکویر میں ارشاد ہے:

فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الۡجَوَارِ الۡكُنَّسِ ﴿۱۶﴾[1]

نہیں! میں قسم کھاتا ہوں پس پردہ جانے والے ستاروں کی۔ جو روانی کے ساتھ چلتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں-

اسے بلیک ہول کا نام دینا درست نہیں۔ جو دکھائی نہیں دیتا اسے سیاہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اس کے لیے قرآنی تعبیر الْخُنَّس چھپ جانا، پس پردہ جانا، نہایت موزوں نام اور قرین فہم ہے تاہم ہم مفروضوں پر قرآن کی تطبیق کرنا درست نہیں سمجھتے۔

بگ بینگ کے بعد ابتدائی کائنات کے بارے میں خیال کیا گیا کہ شروع میں کائنات گیس یعنی ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس پر مشتمل تھی۔ بعد میں کہا گیا گیس نہیں غبار (Cosmic Dust) کی صورت میں تھی۔ بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا یہ غبار کی مانند بھی نہیں تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ''دھواں'' تھی۔ یعنی اپنی ترکیب اور حجم میں '' دھواں'' تھی۔ لہٰذا بالآخر بات یہاں آکر رک گئی کہ کائنات کی ابتدائی صورت دھویں (Smoke) کی تھی:

ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ ....[2]

---

[1] سورة التکویر: ۱۵-۱۶

[2] سورة فصلت: ۱۱

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت دھواں تھا۔

توازن در کائنات

کائنات میں ایک اعتدال اور توازن قائم ہے جس کی بدولت یہ کائنات پھیلی اور ارتقائی عمل میں آئی۔ حتیٰ کہ موجودہ DNA تک اسی توازن کے مرہون منت ہے۔ اگر اس توازن میں ذرہ برابر بھی فرق آتا تو کائنات کا وجود اور اس میں زندگی ممکن نہ ہوتی۔

بقول ڈاکٹر عطاء الرحمن کہتے ہیں: اگر عظیم انفجار (دھماکے) کی قوت میں معمولی فرق ہوتا، ایک بٹا ارب ارب ارب ارب ارب کروڑویں حصے کی کمی آ جاتی تو کائنات تخلیق نہ ہو پاتی اور زندگی برقرار رکھنے کا ضروری سامان فراہم نہ ہو سکتا۔ اسی طرح پروٹون اور نیوٹرون کی قوت اپنی موجودہ مقدار سے ذرہ برابر بھی مختلف ہوتی تو زندگی ناممکن ہو جاتی۔ اسی طرح دیگر طبیعاتی توازن کی بھی یہی صورت ہے۔ کائنات پر حاکم توازن کی بدولت یہاں سب کچھ موجود ہے۔

قانون توازن الحادی نظریہ رکھنے والوں کے لیے نہایت مشکل مسئلہ ہے۔ وہ اس توازن کو اتفاقیہ قرار نہیں دے سکتے۔ اس حقیقت سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے غیر حقیقی واہموں اور مفروضوں کا سہارا لیتے ہیں۔

سائنسی تھیوری پر قرآن کی تطبیق

یہ نہایت خطرناک امر ہے کہ بعض معاصر اہل قلم نے نظریہ اضافت اور نظریہ بگ بینگ (Big Bang) کو قرآنی آیات پر تطبیق کرنے کی جسارت کی ہے۔ مثلاً قرآن سے نظریہ اضافت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ آئن سٹائن کا نظریہ ''روشنی کی رفتار مستقل ہے'' کے تحت یہ تھا کہ روشنی کی رفتار تبدیل نہیں ہوتی۔ یہ نظریہ کئی برسوں تک سائنسی کامیابیوں کے لیے بنیاد سمجھا جاتا رہا لیکن لندن کے امپریل کالج کے سائنسدانوں نے آئن سٹائن کی اس تھیوری کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔[1]

چرچ کی اسی خطرناک غلطی اور ناسمجھی کی وجہ سے مذہب بدنام ہوا اور لوگ ملحد ہو گئے۔ عالم اسلام اس گھناؤنی جرم سے پاک تھا لیکن بعض لوگ اس ناقابل تلافی جرم کا اعادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سائنسدان کل کائنات ایک کلیت میں لا کر نہیں دیکھ سکتے۔ وہ کائنات کے مختلف اجزاء اور حصوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں مجموعی کیفیت معلوم نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انسان کے اجزاء کو جان سکتے ہیں، کلی فطرت کو نہیں۔

[1] روزنامہ جنگ

سائنسی نظریات اکثر و بیشتر قابل تردید ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیں کہ بغرض تحقیق ایک مفروضہ قائم کرتے ہیں۔ اس مفروضے پر تحقیق ہوتی ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ اس مفروضہ کا حقیقت کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔

حقیقت سے مراد مشاہداتی واقعیات ہیں۔ مشاہداتی اور محسوساتی مرحلہ میں آنے کے بعد اس کا واقعی اور حقیقی ہونا معلوم ہوتا ہے۔

مثلاً زمانہ قدیم میں زمین گول ہے یا مسطح کے مسئلہ پر یہ مفروضہ پیش کیا گیا کہ زمین گول ہے۔ چنانچہ مشاہداتی طور پر دیکھنے میں آیا کہ چاند گرہن کے موقع پر زمین کا سایہ گول نظر آتا ہے یا سمندر سے آنے والی کشتیوں کے باد بان پہلے نظر آتے ہیں بعد میں آہستہ آہستہ کشتی نظر آتی ہے۔ اس مشاہدے سے زمین کا گول ہونا حقیقت بن گیا۔

دوسری مثال: کوپرنیکس (Copernicus) نے یہ نظریہ قائم کیا کہ زمین گردش میں ہے۔ یہ مفروضہ اس وقت حقیقت کا روپ دھارنے میں کامیاب ہوا جب دوربین سے اس گردش کا مشاہدہ کیا گیا۔

قرآنی طریقہ استدلال کی اساس محسوسات اور مشاہدات ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــُٔوْلًا ۝۳۶[1]

اور اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں ہے کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے باز پرس ہو گی۔

اس آیت سے چند باتیں صاف ظاہر ہیں:

ایک یہ کہ اسلام علم و یقین کو دلیل تسلیم کرتا ہے۔ لہٰذا کسی بات کے دلیل ہونے کے لیے ضروری ہے:

۱۔ یا تو وہ بات یقینی ہو۔ جیسے سمعی و بصری ہو۔

۲۔ یا اس بات کے دلیل ہونے پر یقینی دلیل موجود ہو۔

دوسرے لفظوں میں دلیل یا خود یقینی ہو یا اس کے دلیل ہونے پر یقین ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ سے ظاہر ہے کہ علم و یقین کے مصادر سمعی وبصری ہیں۔

---

[1] سورة الاسراء:۳٦

تیسری بات یہ ہے کہ وَالْفُؤَادَ۔ قلب وعقل کی بنیاد بھی سمعی وبصری ہے۔ یعنی عقل کی اساس سمع وبصر و دیگر محسوسات فراہم کرتے ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید کی متعدد آیات شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ سمعی وبصری آیات کے ذریعے عقل سے کام لینے کا حکم دیتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾[1]

اور خوف اور طمع کے ساتھ تمہیں بجلی کی چمک دکھانا اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرنے کے لیے آسمان سے پانی برسانا بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے، عقل سے کام لینے والوں کے لیے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

یعنی ان سمعی وبصری بنیادوں پر عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں موجود ہیں:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ مَّاۗءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾[2]

یقیناً آسمانوں اور زمین کی خلقت میں، رات اور دن کے آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو انسانوں کے لیے مفید چیزیں لے کر سمندروں میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانوں سے برسایا، پھر اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد (دوبارہ) زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلایا اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾[3]

[1] سورة الروم:۲۴
[2] سورة البقرة:۱۶۴
[3] سورة النحل:۱۲

اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں، عقل سے کام لینے والوں کے لیے ان چیزوں میں یقیناً نشانیاں ہیں۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۝۵ [1]

اور رات اور دن کی آمد و رفت میں نیز اس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے پھر زمین کو اس سے زندہ کر دیتا ہے اس کے مردہ ہونے کے بعد اور ہواؤں کے بدلنے میں عقل رکھنے والی قوم کے لیے نشانیاں ہیں۔

ان آیات میں دن رات کا آنا جانا آسمان سے نازل ہونے والے پانی سے زمین کا سرسبز و شاداب ہونا اور ہواؤں کا چلنا یہ سب انسان کے محسوسات میں سے ہیں جو عقل کی بنیاد ہیں۔

بصریات سے استدلال کے بارے میں متعدد آیات ہیں:

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ۔۔۔ [2]

کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان میں غور نہیں کیا۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔۔۔ [3]

کہد یجیے: آسمانوں اور زمین میں نظر ڈالو کہ ان میں کیا کیا چیزیں ہیں ....

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ۝۶ [4]

کیاان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا اور مزین کیا؟ اور اس میں کوئی شگاف بھی نہیں ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ

---

[1] سورة الجاثية:۵
[2] سورة الاعراف:۱۸۵
[3] سورة يونس:۱۰۱
[4] سورة ق:۶

فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ③[1]
اس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر بنایا، تو رحمن کی تخلیق میں کوئی بدنظمی نہیں دیکھے گا، ذرا پھر پلٹ کر دیکھو کیا تم کوئی خلل پاتے ہو؟
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ④[2]
پھر پلٹ کر دوبارہ دیکھو تمہاری نگاہ ناکام ہوکر تھک کر تمہاری طرف لوٹ آئے گی۔
هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ....۔[3]
یہ ہے اللہ کی تخلیق اب ذرا مجھے دکھاؤ اللہ کے سوا دوسروں نے کیا خلق کیا ہے۔

سورج

سورج ایک سیکنڈ میں چار ملین ٹن انرجی خرچ کرتا ہے اور چھ ہزار ملین کلومیٹر پر مشتمل علاقے کو روشنی فراہم کرتا ہے۔ اس میں سے زمین کے حصے میں روزانہ ۱۷۳ ٹن انرجی آتی ہے۔ باقی دوسرے سیاروں پر خرچ ہوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر انرجی فراہم کرنے کے لیے سورج میں کون سا ایندھن استعمال ہوتا ہے؟

سائنسدان کہتے ہیں کہ سورج انرجی فراہم کرنے کے لیے ہائیڈورجن کا ایندھن استعمال کرتا ہے اور ہر سیکنڈ میں چار ملین ٹن انرجی فراہم کرنے کے لیے ۶۶۰ ملین ٹن ہائیڈروجن استعمال کرتا ہے۔

باعث تعجب ہے کہ سورج چار یا پانچ ہزار ملین سال سے ایک سکینڈ میں ۶۶۰ ملین ٹن ہائیڈروجن خرچ کررہاہےاوراس کےذخیرۂ قدرت میں ابھی بلکہ آنے والے اربوں سال تک کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

سورج کی حیات آفرین خدمات

۱۔ جانداروں کی زندگی سورج سے ملنے والی حرارت کے مرہون منت ہے۔

۲۔ جانداروں اور نباتات کی ضرورت کی روشنی فراہم کرتا ہے جس کے بغیر حیات حیوانی و نباتی ممکن نہیں ہے۔

۳۔ سازگار فضا کی فراہمی بھی سورج کے ذمے ہے۔ چنانچہ آفتاب کی حرارت میں اونچ نیچ کی وجہ سے فضا میں ہوا کے دباؤ میں فرق آتا رہتا ہے جس سے ہوا رواں دواں رہتی ہے۔ ہوا کی روانی کی

---

[1] سورة الملك:۳
[2] سورة الملك:۴
[3] سورة لقمان:۱۱

وجہ سے بادلوں کا وجود اور ان کی روانی وقوع پذیر ہوتی اور بادلوں سے بارش برستی ہے۔

ہوا ہی کی وجہ سے نباتات میں بارداری ہوتی ہے۔ یعنی نر پودوں سے آفزائش نسل کا مادہ پولن (Pollen) پودوں تک ہوا کے ذریعے پہنچتا ہے۔

۴۔ سمندر کا پانی بخار میں تبدیل کرنا بھی آفتاب کی تابش کی برکت سے ہے۔ اس بخار کا ایک حصہ ہوا میں مطلوبہ نمی برقرار رکھنے کی ضرورت پوری کرتا ہے اور دوسرا حصہ بادلوں کی شکل اختیار کر کے بارش کے ذریعے زمین آباد رکھتا ہے۔

فلکیات کے بارے میں بطلیموسی مفروضے نے تقریباً پندرہ صدیوں تک حکمرانی کی جس میں زمین کو مرکز اور باقی سیارات کو زمین کے تابع بتایا گیا تھا۔ بعد میں جدید سائنسی تجربات کی روشنی میں یہ نظریہ بے بنیاد قرار پایا۔

کوپرنیکس (Copernicus) نے زمین کی مرکزیت کا مفروضہ بے بنیاد قرار دیا اور جرمن سائنسدان کلپر نے ثابت کیا کہ ہر سیارہ سورج کے گرد گھوم رہا ہے۔

نیوٹن نے نظریہ کشش قائم کر کے بطلیموس کا یہ فرسودہ نظریہ باطل ثابت کیا کہ ستارے آسمان کی چھت پر کیل کی طرح ثبت اور آویزاں ہیں بلکہ یہ ثابت کیا کہ عمومی کشش کے تحت یہ تمام اجرام سماوی فضا میں معلق ہیں اور قانون جاذبہ و دافعہ کے تحت یہ نظام قائم ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ اس نظریے کے تحت اگر صرف کشش کا نظام رائج ہو جائے، اجرام ایک دوسرے کے قریب آجائیں تو کشش زیادہ ہونے سے آپس میں متصادم ہو جائیں اور کائنات کے تمام متحرک اجسام متصادم ہو کر تباہ ہو جائیں لیکن قدرت کا نظام ہے کہ قوت کشش کے مقابلے میں قوت دافعہ (مرکز سے دور ہونے) کی طاقت کی وجہ سے تعادل و توازن قائم ہے اور یہ تعادل تمام متحرک اجسام کے درمیان قائم ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ...۔[1]

اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں کو تمہیں نظر آنے والے ستونوں کے بغیر بلند کیا ...۔

امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

أليس الله يقول: بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا؟

[1] سورة الرعد:۲

فقلت: بلی۔

فقال:ثم عمد ولکن لا ترونھا...۔[1]

کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادنہیں ’’ نظر آنے والے ستونوں کے بغیر‘‘؟

میں نے کہا: ہاں۔

فرمایا: یہاں ستون ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے۔

زمین

اگر زمین کی کشش موجودہ سے کم ہوتی تو ہم زمین پرنہیں فضا میں اُڑ رہے ہوتے اور اگر زمین کی کشش موجودہ سے زیادہ ہوتی تو انسان کا زمین پر حرکت کرنا ممکن نہ ہوتا۔

سورج سے فاصلے میں زمین تیسرے اور حجم کے اعتبار سے سیارات میں پانچویں نمبر پر۔

زمین کے مرکز میں درجہ حرارت ۵۰۰۰ ۷ ہے جو سطح سورج کی حرارت سے بھی زیادہ ہے لیکن ہم اہل ارض اس حرارت سے محفوظ ہیں چونکہ سطح زمین حائل ہے۔

اگر سورج سے زمین کا فاصلہ موجودہ فاصلے سے کم ہوتا تو درجہ حرارت میں اضافے کی وجہ سے کرۂ ارض کا سارا پانی خشک ہو جاتا اور زمین خشک اور بنجر بن جاتی۔

اگر یہ فاصلہ موجودہ فاصلے سے زیادہ ہوتا تو زمین منجمد برف کی طرح ہو جاتی تو کیا زمین اس مناسب فاصلے پر اتفاقاً موجود ہے؟

منظومہ شمسی میں موجود تمام سیارات کا زمین میں حیات کے لیے سازگار ماحول فراہم کرنے میں دخل ہے۔

مثلاً سب سے بڑے سیارے مشتری کا وجود زمین میں حیات کے استقرار وقرار کے لیے ضروری ہے کیونکہ سیارہ مشتری نہ ہوتا اور اسی حجم میں نہ ہوتا تو زمین فضا میں موجود شہابوں اور دمدار ستاروں کی زد میں آ جاتی۔ لہٰذا سیارہ مشتری کرۂ ارض کی مدد وحفاظت کے لیے موجود ہے۔ چنانچہ مشتری اگر موجودہ مدار میں نہ ہوتا کسی اور مدار میں ہوتا تو بھی زمین محفوظ نہ رہتی۔

قابل توجہ ہے کہ زمین کی بالائی فضا میں درجہ حرارت منفی ۲۷۰ ہے جہاں کسی زندہ کے زندہ رہنے کی گنجائش نہیں ہے جب کہ زمین پر درجہ حرارت ہماری زندگی کے لیے سازگار ہے۔

---

[1] تفسیر القمی ۲:۳۲۸

حجم زمین

زمین کا حجم موجودہ سے کم ہوتا تو کشش کمزور ہونے کی وجہ سے فضائی غلاف کا اس کے گرد رہنا ممکن نہ ہوتا۔ اس صورت میں زمین آسمان سے آنے والے شہابوں سے محفوظ نہ رہتی۔ آکسیجن سے بھی محروم ہو جاتی اور حیات کے لیے سازگار نہ ہوتی۔

فضا میں موجود غلاف ارضی میں آکسیجن کا تناسب بھی قصد و شعور اور ارادے کا پتہ دیتا ہے۔

اگر آکسیجن کا تناسب اکیس فیصد کی جگہ بائیس فیصد ہوتا تو معمولی چنگاری سے کرۂ ارض کے تمام جنگلات جل کر راکھ ہو جاتے۔ اگر یہ تناسب پچیس فیصد ہو جائے تو کرۂ ارض تباہ ہو جائے چونکہ آکسیجن جلنے جلانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

لیکن اگر آکسیجن کا تناسب کم ہو جائے تو ہم پھر بھی زندہ نہیں رہ سکتے چونکہ نباتات کاربن آکسائڈ، آکسیجن میں تبدیل کر کے ہمیں فراہم کرتے ہیں۔ اگر نباتات آکسیجن پیدا نہ کرتے تو ایک مدت میں آکسیجن ختم ہو جاتی۔

لہٰذا یہ فضائی غلاف جہاں ہماری حفاظت کرتا ہے اس کے ساتھ ہمیں سانس لینے کے لیے ہوا بھی فراہم کرتا ہے۔

یہ اللہ ہی کی قدرت وحکمت ہے کہ زمین پر آکسیجن کا تناسب برقرار رہتا ہے۔

اگر یہاں اتفاقیہ کی کوئی گنجائش ہوتی تو اس تناسب کے برقرار رہنے کی کوئی ضمانت نہ ہوتی۔ اتفاقاً یہ تناسب بے ہنگم کم و بیش ہو جاتا اور زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔

بادل

قدرت کا نظام قابل توجہ ہے کہ پانی، دھوپ اور ہوا میں باہمی ہم آہنگی کی وجہ سے خشک زمین سیراب ہو جاتی ہے۔

سمندر کے پانی پر دھوپ پڑنے سے بخار آسمان کی طرف اٹھتا ہے۔ بخار کیا چیز ہے؟ بخار پانی کے نہایت چھوٹے چھوٹے فضا میں اٹھنے والے ذرات ہیں۔ فضا کی بلندیوں میں سردی ہوتی ہے۔ اس سردی سے ٹکرا کر یہ بخارات بادل کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ بارش برسانے والے بادلوں میں عموماً تین لاکھ ٹن تک پانی موجود ہوتا ہے۔ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا۔[1]

---

[1]سورۃ الفرقان: ۴۸۔ (ترجمہ) اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی برسایا ہے۔

بارش کا پانی ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک ہوتا ہے۔ نمکین سمندر سے اٹھنے والے پانی میں نمک کی مقدار نہایت مناسب ہوتی ہے۔ اگر نمک کی مقدار اس تناسب سے زیادہ ہوتی تو اس کھارے پانی سے زمین آباد نہ ہوتی۔

سمندر کا پانی ایک سکینڈ میں ۱۶ ملین ٹن بخارات میں تبدیل ہوتا ہے۔ تازہ ترین تحقیقات کے مطابق یہ پانی سال میں ۵۰۵ ٹریلین ٹن تک پہنچ جاتا ہے اور بارش کے ذریعے زمین تک آنے والے پانی کی یہ مقدار اور تناسب ہر سال برقرار رہتا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ چنانچہ قرآن مجید نے ایک ہزار چار سو سال پہلے بیان فرمایا:

وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ۝۱۱ [1]

اور جس نے آسمان سے پانی ایک مقدار میں نازل کیا جس سے ہم نے مردہ شہر کو زندہ کر دیا، تم بھی اسی طرح (قبروں سے) نکالے جاؤ گے۔

زمین پر حیات کا وجود پانی کے بخارات میں تبدیل ہونے اور پھر بخارات کا پانی میں تبدیل ہونے کے تناسب کا مرہون منت ہے۔ یہ پانی کا ایک سرکل (Circle) کہلاتا ہے اور اگر اس سرکل میں معمولی تبدیلی بھی ہو جائے تو زمین پر حیات کا برقرار رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

چاند

چاند زمین کے گرد ۲۲ دنوں میں ایک چکر پورا کرتا ہے اور ہم چاند کو کبھی کامل، گول اور کبھی نصف دائرے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ چاند کا روشن حصہ زمین کے گرد گردش کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔

زمین اور چاند میں کشش کا تبادلہ ہوتا ہے لیکن زمین کی کشش چاند کی کشش سے چھے گنا زیادہ ہے۔ اس کے باوجود چاند کی کشش کے زمین پر اثرات مترتب ہوتے ہیں اور چاند کی کشش سمندروں کے مدوجزر کا سبب بن جاتی ہے۔ چاند کی یہ کشش اہل ارض کے لیے مناسب رہتی ہے۔

چاند کی خدمات

۱۔ چاند کی خدمات میں سے ایک یہ ہے کہ صفحہ آسمان پر قدرتی کلینڈر ہے جو ہر خواندہ ناخواندہ

[1] سورۃ الزخرف:۱۱

شخص کے لیے قابل دید وفہم ہے۔ قدرتی تقویم سمجھنے کے لیے ماہر نجوم ہونا ضروری نہیں ہے۔

سمندر کے پانی کا مد و جزر چاند کی کشش سے رونما ہوتا ہے جو ہر چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ واقع ہوتا ہے جس کے تحت سمندر کا پانی کئی انچ تک چاند کی کشش سے کھینچ جاتا ہے۔

اس مد و جزر کی مقدار کے تعین میں چاند کا زمین سے فاصلہ فیصلہ کن ہے۔ اگر چاند موجودہ مسافت سے کم فاصلے پر ہوتا، مثلاً فاصلہ پچاس ہزار میل کم ہوتا تو ہماری زمین چاند کی کشش کی وجہ سے دن میں دو بار غرق ہو جاتی۔

زمین مہربان ماں

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ۔ [1]

اور زمین میں اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔

فضائے کائنات عام طور پر زندگی کے لیے ساز گار نہیں ہے۔ اس لیے اس ناسازگار فضا میں زندگی کے پنپنے کے لیے بہت کچھ فراہم کرنا پڑتا ہے۔

فضائے ارضی

زمین پر حیات برقرار رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے زمین کے گرد ایک غلاف بنایا۔ یہ غلاف نہ ہوتا تو زمین پر حیات ممکن نہ ہوتی۔

ذیل میں ہم ذکر کریں گے کہ زمین پر حیات برقرار رکھنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑا ہے۔

۱۔ آکسیجن کی فراہمی: زمین کی فضا میں آکسیجن کی فراہمی سے زمین پر حیات ممکن ہوئی۔ فضا میں آکسیجن معلق رکھنے میں زمین کے حجم کا دخل ہے۔ اگر زمین کا حجم موجودہ سے بڑا ہوتا تو آکسیجن زمین میں چلی جاتی اور سطح زمین پر آکسیجن نہ ہونے سے حیات ممکن نہ ہوتی۔ اگر زمین موجودہ حجم سے چھوٹی ہوتی تو آکسیجن فضا میں بکھر جاتی اور معلق نہ رہتی۔

۲۔ یہ غلاف کرۂ ارض پر حرارت اعتدال میں رکھتا ہے۔ اگر یہ غلاف نہ ہوتا تو زمین بھی چاند کی طرح ہوتی۔ ایک طرف درجہ حرارت سو درجے اور دوسرے طرف منفی سو درجے ہے اور زمین قابل سکونت نہ ہوتی۔

۳۔ آسمان سے گرنے والے کروڑوں شہاب اگر براہ راست زمین پر آتے تو حیات ممکن نہ ہوتی۔ یہ شہاب فضا میں موجود غلاف سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں اور زمین پر نہیں آ سکتے۔

[1] سورة الذاريات: ۲۰

۴ یہ غلاف سورج سے آنے والی مضر شعاعیں اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین پر آنے والی قاتل شعاعوں کی وجہ سے یہاں حیات ممکن نہ ہوتی۔ چنانچہ ان شعاعوں میں سے صرف بقدرِ ضرورت شعاعیں زمین تک پہنچتی ہیں۔

ارشادِ الٰہی ہے:

وَجَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ۖۚ وَّهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ۔[1]

اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا اور اس کے باوجود وہ اس کی نشانیوں سے منہ موڑتے ہیں۔

۵۔ اگر زمین کا حجم موجودہ سے بڑا یا چھوٹا ہوتا تو یہاں حیات کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوتی۔

۶۔ اگر زمین کی موجودہ محوری حرکت جو ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے، سے گھٹ کر سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات موجودہ حالت سے دس گنا زیادہ لمبے ہوتے۔ اس صورت میں گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی سے یہاں حیات ممکن نہ ہوتی۔

۷۔ زمین کا سورج سے فاصلہ موجودہ مسافت سے مختلف ہوتا تو بھی زمین پر حیات ممکن نہ ہوتی اور یہ مسافت کروڑوں سال سے ایک جیسی ہے۔

۸۔ زمین سورج کے گرد ۱۸ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چکر کاٹ رہی ہے۔ اگر یہ رفتار موجودہ رفتار سے مختلف ہوتی تو زمین پر حیات ممکن نہ ہوتی۔

ہوا میں تناسب

ہوا میں موجود آکسیجن، جو زندگی کی بنیادی ضرورت ہے اور جس کے بغیر کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا، کا خاص تناسب ہے۔

چنانچہ نائٹروجن ۷۸ فیصد اور آکسیجن اکیس فیصد ہوا میں موجود ہے۔

سوال یہ ہے کہ حیات بخش عناصر دوسرے عناصر سے مخلوط ہوئے بغیر مطلوبہ عناصر کے ساتھ کیوں متحد ہوئے اور زندہ موجودات کے زندہ رہنے کے لیے ضرورت کی حد تک کیوں محدود ہوئے؟

چنانچہ اگر آکسیجن اکیس فیصد کی جگہ پچاس فیصد ہو جاتی تو ایک چنگاری سے ہر وہ چیز جل کر

[1] سورۃ الانبیاء:۳۲

راکھ ہوجاتی جوجل سکتی ہے اور اگر آکسیجن کی نسبت دس فیصد کم ہو جائے تو زمین پر زندگی معدوم ہو جائے۔

اگر یہاں کسی قصد و ارادے کا دخل نہیں ہے تو زندگی کے لیے مطلوبہ تناسب کیسے قائم ہوا؟

علّت اول۔ قانون سببیت

بچہ جب چار پانچ سال کا ہو جاتا ہے تو اس کے ذہن میں سوالات اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں:

مجھے کس نے بنایا؟ یہ دنیا کس نے بنائی؟

بچے کے ان سوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے پر قانون سبب منکشف ہوا ہے کہ ہر ''اثر کا مؤثر ہونا چاہیے۔'' اس طرح سبب اور مسبب، اثر اور مؤثر کا سلسلہ چل پڑتا ہے جو اپنے وجود سے شروع ہوتا اور سبب اول، جس کے لیے کسی سبب کی ضرورت نہیں ہے، پر ختم ہوتا ہے۔ سائنسدان بھی اپنی تحقیقات قانون سبب کی بنیاد پر جاری رکھتے ہیں۔ سائنسدانوں کا اس پر ایمان ہوتا ہے کہ کائنات پر '' قانون سبب'' حاکم ہے۔

چنانچہ ہر قدم، ہر فکر اور ہر نتیجہ اسی قانون کے تحت ہے۔

بچے اور کچھ سادہ لوگ یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ اگر ہر چیز کو اللہ نے بنایا ہے تو خود اللہ کو کس نے بنایا؟ یعنی قانون سبب کے تحت اللہ کے وجود کا سبب تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کے ایک مفکر ''برٹرینڈ رسل'' (Bertrand Russell) نے یہی سوال اٹھایا: اللہ کو کس نے بنایا؟

بچوں کو نہیں پختہ عقل رکھنے والوں کو سادہ الفاظ میں سمجھاتے ہیں:

> ہر چیز کا سبب ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ جب مسبب الاسباب یعنی سبب اول تک پہنچتا ہے تو سوالات کا سلسلہ رک جاتا ہے اور کہا جائے گا ہر چیز ''وجود'' سے ''موجود'' ہے۔ خود ''وجود'' کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا کہ کس چیز سے ''موجود'' ہے۔ ''وجود'' بذات خود موجود ہے۔ ''اللہ تعالیٰ'' نفس وجود کا نام ہے۔ اس کی حسّی مثال یہ ہے کہ ہر چیز پانی سے مرطوب ہے۔ خود ''پانی'' کس سے مرطوب ہے؟ جواب یہ ہے کہ پانی بذات خود مرطوب ہے۔

فلاسفروں میں مشہور ہے: الذاتي لا يعلّل۔

مشہور ماہر فزیالوجسٹ انڈری کونو ای ایغی (Anguray Conway Ivy) کہتے ہیں:

قانون سبب ہر چیز میں نظر آتا ہے۔ مثلاً مچھلی کی ''نتھی'' دلیل ہے کہ پانی پہلے موجود تھا۔ پرندوں کے'' پر'' اور انسان کا '' سانس لینا'' بتاتا ہے کہ ہوا پہلے سے موجود تھی اور انسان کی'' آنکھیں'' بتاتی ہیں کہ'' روشنی'' پہلے سے موجود تھی۔ اسی طرح انسان میں'' آگہی کا شوق'' بتاتا ہے کہ'' واقعیات'' پہلے سے موجود تھیں۔

چنانچہ حیات بتاتی ہے کہ حیات کا لازم'' قانون طبیعت'' پہلے سے موجود تھا۔

اب سوال کرتا ہوں: کیا انسان میں موجود گہری فکر و تدبر، اس پر دلیل نہیں ہے کہ اس سے پہلے کوئی شے موجود ہے؟ یہ بات حماقت پر مبنی ہوگی کہ یہ تصور کیا جائے کہ سن سے پہلے کسی چیز کے موجود ہونے پر دلیل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں یہ ساری باتیں اس پر دلیل ہیں کہ اس سے پہلے ایک بلند پایہ عقل موجود ہے۔ یہ سب ایک خالق کے وجود پر دلیل ہیں جو ان لوگوں کے ضمیروں میں تجلی فرماتا ہے جو بلند پایہ عقل اور بالاتر خالق کے بارے میں تحقیقات کرتے ہوئے اپنے عقل کے سامنے پردے حائل نہیں کرتے۔

میکس پلینك (Max Planck) جس نے ایٹم کی طرف پہلا قدم اٹھایا، کہتے ہیں:

دین اور سائنسی علوم دونوں شک، کفر اور خرافات کے خلاف جنگ میں شریک ہیں۔ اس جنگ میں صدائیں ہمیشہ اللہ کی طرف بلند ہوں گی۔ [1]

نباتات میں اللہ کی آیات

ہر گیاهی کہ از زمین روید
وحده لا شریک له گوید

(حکیم ناصر خسرو)

حیوانات و نباتات میں تبادلہ حیات

تنفس کے لیے جس ہوا سے استفادہ کرتے ہیں اس میں آکسیجن کی ایک معین مقدار ہوتی ہے۔ آکسیجن ایک حیات بخش مادہ ہے جس سے طبیعی حرارت پیدا ہوتی ہے جس کے بغیر زندگی پانچ منٹ سے زیادہ برقرار نہیں رہ سکتی۔

[1] اللہ یتجلی فی عصر العلم۔

تنفس کے ذریعے آکسیجن کی ایک مقدار پھیپھڑوں میں جاتی ہے جو پھیپھڑوں میں موجود خون میں شامل ہو کر گردش خون کے ذریعے تمام اجزاء تک پہنچ جاتی ہے۔ آکسیجن جسم کے خلیوں میں آہستہ آہستہ ایک ہلکی حرارت کے ذریعے غذا کو جلا دیتی ہے۔ بدن میں حرارت اسی احتراق کی وجہ سے موجود رہتی ہے اور خلیوں میں غذا کے احتراق کی وجہ سے ایک زہریلی گیس خارج ہوتی ہے جسے کاربن ڈائی آکسائڈ کہتے ہیں۔

خون جب واپس پھیپھڑوں میں آتا ہے تو یہ زہریلی گیس (کاربن) خون کے ساتھ پھیپھڑوں میں آجاتی ہے اور یہاں سے تنفس کے ذریعے جسم سے خارج ہو کر آزاد فضا میں چلی جاتی ہے۔ اس طرح تمام جاندار تنفس کے ذریعے آکسیجن اپنے جسم میں داخل اور زہریلی گیس کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں۔

اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو ایک مختصر مدت میں حیات بخش آکسیجن ختم ہو جاتی اور اس کی جگہ زہریلی گیس کاربن آکسائیڈ سے فضا پُر ہو جاتی اور حیوانات کی زندگی آہستہ آہستہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی۔

انسان بھی اس خطرے سے مستثنیٰ نہیں ہے چونکہ ہر انسان چوبیس گھنٹے میں تنفس کے ذریعے ۲۵۰ گرام کاربن ڈائی آکسائیڈ اپنے پھیپھڑوں سے خارج کرتا ہے۔

اس طرح زمین پر بسنے والے اربوں انسانوں اور دیگر جانداروں سے نکلنے والی کروڑوں ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ سے پوری فضا زہریلی گیس سے پر ہو جاتی اور یہاں زندگی نابود ہو جاتی۔

نباتات کی حیات بخش خدمات

یہاں نباتات کا حیات بخش کردار خالق حیات کا عظیم معجزہ ہے۔ نباتات اس زہریلی گیس کو اپنی غذا بناتے اور حیات بخش آکسیجن خارج کرتے ہیں۔ اس فضا سے زہریلی گیس نہ صرف ختم کرتے ہیں بلکہ اسے اپنی غذا بنا کر زمین پر بسنے والوں کو ضروریات اور ساتھ حیات بخش آکسیجن فراہم کرتے ہیں۔

نباتات بھی حیوانات کی طرح تنفس کرتی ہیں مگر حیوانات کے برعکس زہریلی گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ کو اپنے میں داخل کرتی اور آکسیجن خارج کرتی ہیں۔

کیا یہ تبادلہ، حیات کا عظیم معجزہ، اس بات کی یقینی دلیل نہیں ہے کہ اس نظام کو ایک حکیم ذات نے قائم کیا ہے۔

اگر دنیا میں صرف حیوانات ہوتے تو آکسیجن ختم ہو جاتی۔ اگر صرف

نباتات ہوتیں تو کاربن ڈائی کسائیڈ ختم ہوجاتی۔ دونوں صورتوں میں حیات ختم ہو جاتی۔

ایک اہم درس توحید

قدیم دانشمندوں کا خیال تھا کہ عناصر چار ہیں: آب و خاک و آتش و ہوا۔ آج کے دانشمندوں نے ایک سو بیس عناصر کا انکشاف کیا ہے۔ ان میں سے ۹۲ قدرتی عناصر ہیں باقی تجربہ گاہوں میں تجربے کے ہیں۔

نباتات میں ان عناصر میں سے ۲۲ عناصر موجود ہیں۔ ان میں سے دس عناصر کی ترکیب سے نباتات موجود ہوا کرتی ہیں۔

نباتات کی جڑوں میں ان کے خالق نے جو شعور و آگہی ودیعت فرمائی ہے اس کے تحت یہ جڑیں شناخت رکھتی ہیں کہ مطلوبہ نبات کے لیے بائیس عناصر میں سے کن دس عنصروں کا انتخاب کرنا ہے۔

اگر کوئی سائنسدان کسی پیشرفتہ لیبارٹری میں ان عناصر کی شناخت کر کے انہیں جمع کر بھی لے وہ ان عناصر کو جوڑ کر مطلوبہ پودا نہیں اُگا سکتا۔

چنانچہ اگر گندم کا بیج ہے تو اس سے پھوٹنے والی طاقتور جڑیں جانتی ہیں کہ گندم اگانے کے لیے کن عناصر کو جوڑنا ہے۔ اگر زیر زمین جانے والا دانہ مکئی کا ہے تو اسے معلوم ہے کہ مکئی اُگانے کے لیے کن عناصر کو اپنے میں جذب کرنا ہے۔ چنانچہ یہ دانہ باقی عناصر سے چن چن کر ان عناصر کو چوس لیتا ہے جن سے مکئی بنتی ہے۔

ان جڑوں کو کبھی اشتباہ نہیں ہوتا کہ بیج گندم کا تھا اس کی جگہ باجرہ اُگا دیا ہو۔

ترکیب عناصر ارضی

نباتات کو ملنے والا درس توحید نہایت اہم ہے کہ ۲۲ عناصر کی مختلف ترکیبوں سے لاکھوں اقسام کی نباتات وجود میں آتی ہیں جو عناصر کی ترکیب، قصد وارادے کی قطعی دلیل ہے۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ حروف تہجی اردو زبان میں چالیس کے قریب ہیں۔ ان حروف کو آپس جوڑ کر الفاظ وجود میں آتے ہیں۔ الفاظ سے علمی مطالب یا شعری بلاغت وجود میں آتی ہے۔ حروف کی اس ترکیب کے پیچھے ایک قصد وارادہ ہے تو عبارت بامعنی بنے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ حروف جوڑنے والے کے بغیر خود سے جڑ کر یہ شعر بن جائے۔

برگ درختان سبز پیش خداوند هوش
هر ورقی دفتریست معرفت کردگار
(سعدی)

درخت کے پتوں کے درمیان ایک مرکزی ریشہ ہوتا ہے۔ اس سے باریک ریشے پتے کی ہر طرف پھیلے ہوتے ہیں۔

درخت کے پتوں سے تین اہم کام انجام پاتے ہیں۔

۱۔بخارات: یہ پتے درخت کی جڑوں سے حاصل ہونے والے پانی کا ایک حصہ بخارات کی شکل میں فضا میں پھینکتے ہیں جس سے فضا مرطوب ہو جاتی اور خشکی دور ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک ہیکٹر زمین کی نباتات و درخت روزانہ بارہ گھنٹوں میں بیس ہزار لیٹر بخارات فضا میں پھینکتے ہیں۔

۲۔ تنفس: دوسرا اہم کام درختوں کے پتوں کا عمل تنفس ہے۔ اس سے یہ جانداروں کے برخلاف کاربن ڈائی آکسائیڈ اپنے میں لیتے اور آکسیجن خارج کر کے فضا میں بکھیرتے ہیں۔ البتہ رات کو صرف کاربن آکسائیڈ پھینکتے ہیں۔

حدیث میں اسی لیے فرمایا گیا ہے:

رات کو درخت کے نیچے سونا مکروہ ہے۔

کراہت اس لیے ہے کہ یہ انسانی صحت سے سازگار نہیں ہے۔

۳۔ کاربن گیری: جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا کہ جانداروں سے فضا میں پھیلنے والی زہریلی گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ کو درخت اپنا حصہ بناتے ہیں اور قدرتی نظام کے تحت اس زہریلی گیس سے جانداروں کے کھانے کے مختلف میوے اور دانے پیدا کرتے ہیں۔جل الخالق۔

پانی اور مٹی

زمین پر آنے والا پانی جب مٹی سے مخلوط ہوتا ہے تو پانی اور مٹی کے ذرات میں جذب و دفع کی صورت پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے زمین کے ذرات میں جنبش پیدا ہوتی ہے اور زمین کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ۔[1]

[1]سورة الحج:۵

اور تم دیکھتے ہو کہ زمین خشک ہوتی ہے لیکن جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو یہ جنبش میں آجاتی اور ابھرنے لگتی ہے اور مختلف اقسام کی پر رونق چیزیں اگاتی ہے۔

آیت میں نباتات کے تین مراحل کا ذکر ہے: اھتزاز جنبش، ربت پھولنا اور انبتت اگنا۔

پانی

پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن کی کیمیائی ترکیب سے بنتا ہے۔ یہ دونوں عناصر حرارت پذیر ہیں۔ یہ دونوں آگ پر ایسے لپکتے ہیں جیسے بھوکا روٹی پر لیکن ان دونوں کی ترکیب سے پانی وجود میں آتا ہے جو آگ بجھا دیتا ہے۔

پانی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ایک اہم نعمت اور اہم معجزات میں ایک معجزہ ہے۔ پانی ایک صاف شفاف مائع ہے جس کا کوئی رنگ، ذائقہ اور بو نہیں ہے۔ یہ تمام زندوں کی زندگی کی ضرورت ہے اور کرۂ ارض کے دو تہائی حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ آکسیجن اور ہائیڈروجن کی کیمیائی ترکیب سے بنتا ہے اور پانچ سوملین ذرات ملنے سے پانی کا ایک قطرہ تیار ہوتا ہے۔

انسان اور دیگر حیوانات کے اکثر خلیے پانی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ چنانچہ پانی کی مقدار کم ہونے کی صورت میں خشکی حتیٰ موت کی نوبت آجاتی ہے۔

ارشاد باری ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ۔[1]

تمام جاندار چیزوں کو ہم نے پانی سے بنایا ہے تو کیا (پھر بھی) وہ ایمان نہیں لائیں گے؟

بعض زندہ چیزوں میں پانی ۹۰ فیصد اور انسان میں جسم کے وزن کا ۶۰ فیصد ہوتا ہے اور انسانی دماغ ۷۰ فیصد پانی پر مشتمل ہے۔ پھیپھڑوں میں ۹۰ فیصد، خون میں ۸۳ فیصد پانی ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّن مَّآءٍ ۝....۔[2]

اور اللہ نے زمین پر چلنے والے ہر جاندار کو پانی سے خلق فرمایا۔

پانی سے مراد پانی ہی ہے خواہ خلیہ مراد لیں یا پروٹین (Proteins) یا نطفہ سب بیشتر پانی پر مشتمل ہیں۔ حدیث میں ہے:

[1] سورۃ الانبیاء:۳۰
[2] سورۃ النور:۴۵

فجعل نسب کل شئ الی الماء ولم یجعل للماء نسبا۔[1]
ہر چیز کا نسب پانی تک ہے اور پانی کا کوئی نسب نہیں بنایا۔

پانی کی تین حالتیں ہیں: منجمد، مائع اور بخار۔ پانی جب بخار بنتا ہے تو اس میں انرجی ہوتی ہے اور جب منجمد ہو جاتا ہے تو انرجی ختم ہو جاتی ہے۔

پانی کے ذخائر

۱۔ زمین کے گرد فضائی غلاف پانی ذخیرہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ بخارات اور بادلوں میں اہل ارض کی ضرورت کا پانی موجود ہوتا ہے۔

۲۔ دریا بھی پانی ذخیرہ کرنے کا اہم ذریعہ ہیں۔ چنانچہ کئی ملین سال سے گزرنے کے باوجود ان دریاؤں میں پانی جاری و ساری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی ہمیشہ حرکت میں ہے۔ چنانچہ یہ دریا، زیر زمین چشموں اور بارش سے آنے والے سطح زمین کے پانی اور سمندری پانی کے ساتھ نقطہ اتصال ہے۔ اس طرح میٹھے اور سمندر کے کھارے پانی میں ایک دائمی تبادل موجود ہے اور کروڑوں سال گزرنے کے باوجود اس تبادلہ میں کوئی خلل نہیں ہے۔

۳۔ زیر زمین پانی کا اہم ذخیرہ موجود ہے۔ زمین پر بارش کا پانی برستا ہے تو یہ پانی زمین میں تہ نشین ہو جاتا ہے۔ ایک حدتک زیر زمین چلا جاتا اور زمین میں موجود چٹانوں تک پہنچ جاتا ہے۔ چٹانوں کی وجہ سے پانی اس جگہ رک جاتا ہے۔

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسۡكَنّٰهُ فِى الۡاَرۡضِ‌ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوۡنَ‌۔[2]

اور ہم نے آسمان سے ایک خاص مقدار میں پانی برسایا پھر اسے زمین میں ہم نے ٹھہرایا اور ہم یقیناً اسے ناپید کرنے پر بھی قادر ہیں۔

زیر زمین پانی سطح زمین کے پانی کی نسبت صحت بخش ہوتا ہے چونکہ اس سے مضر جراثیم اور بکٹیریا مر جاتے ہیں۔

---

[1] الکافی ۸: ۹۴

[2] سورة المومنون: ۱۸

۴۔ برف بھی پانی ذخیرہ کرنے کا ایک قدرتی انتظام ہے۔ انسان کے لیے تو پانی ذخیرہ کرنا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب تالاب یا ڈیم بنائے جائیں۔ اللہ تعالیٰ اس پانی کو برف کی صورت میں جما کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر ذخیرہ کرتا ہے پھر وہاں سے بِقَدَرٍ ضرورت کے مطابق زیر زمین علاقوں میں پانی آتا رہتا ہے۔

۵۔ گلیشیئرز بھی پانی ذخیرہ کرنے کے قدرتی ذرائع ہیں۔

اس طرح پانی کا ہر قطرہ ایک لامتناہی سلسلے میں رہتا ہے چونکہ کرۂ ارض پر ۳۲۰ ملین مربع میل پانی موجود ہے اور پانی کی یہی مقدار ہمیں میسر رہے گی۔ نہ زیادہ، نہ کم۔ جو پانی آپ آج استعمال کر رہے بعینہ یہی پانی روز اول سے موجود تھا۔ لہٰذا عین ممکن ہے جو قطرہ آپ کے سر پر گرا ہے وہی قطرہ صدیوں پہلے آپ کے اجداد کے سروں پر گر چکا ہو۔

پانی روز اول سے موجود ہے

انسانی جسم تقریباً ۵۵ سے ۶۰ فیصد تک پانی سے بنا ہوا ہے۔ انسان کا دل اور دماغ تقریباً ۷۵ فیصد پانی سے بنا ہوا ہے۔ پھیپھڑے ۸۳ فیصد پانی پر مشتمل ہیں۔ خشک ہڈیوں میں بھی ۳۱ فیصد پانی ہے۔

پانی ہمارے دماغ اور ریڑھ کی ہڈی کو توانائی بخشتا اور آنکھوں کو چکنا رکھنے والی رطوبت فراہم کرتا ہے۔

انسانی جسم سے ہر روز پسینے، سانس اور پیشاب کے ذریعے تقریباً ڈیڑھ لیٹر پانی کا اخراج ہوتا ہے۔

جب جسم میں پانی کی کمی ہوتی ہے تو دماغ سگنل بھیجتا ہے کہ ہارمون کا اخراج ہو۔ یہ ہارمونز گردوں تک پہنچتے ہیں اور گردے میں موجود خلیات کو متحرک کرتے ہیں۔ یہی خاص چینل خون میں زیادہ پانی بچانے کا عمل شروع کرتا ہے اور جسم کے لیے بہت کم پانی چھوڑتا ہے تاکہ جسم سے پانی کا اخراج روکا جا سکے۔ دماغ پانی کی قلت سے پیدا ہونے والی حالت سے نمٹنے میں مدد دیتا ہے اور پانی کی نہایت قلت کی صورت میں دماغ برداشت کا نظام نافذ کرتا ہے۔

پہاڑ اور شیرین پانی

بارش کا پانی جب بلند پہاڑوں پر گرتا ہے تو خاک کے ذرات، چٹانوں اور معدنیات سے گزرنے کی وجہ سے صاف و شفاف ہو جاتا ہے۔ پہاڑوں پر جمی برف جب پگھل کر زیرین علاقے سیراب کرتی ہے تو یہ پانی پہاڑوں کے شگافوں میں موجود فاسفورک ایسیڈ، پوٹاشیم، نائٹرک ایسیڈ (Nitric

(acid) وافر مقدار میں لے کر آتا ہے۔ اس طرح ہماری زراعت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوتی ہے۔
بے بصیرت نیچر یا اتفاقیہ کی بصیر ! کیا کہنے!! اس جگہ یہ آیت نہایت قابل توجہ ہے:
وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا۔[1]
اور ہم نے اس میں بلند پہاڑ گاڑ دیے اور ہم نے تمہیں شیرین پانی پلایا۔

[1] سورة المرسلات:۲۷

اتفاقیہ

مسئلہ حیات

زمین پر زندگی کی ابتدا کیسے اور کیونکر ہوئی؟ یہ ایک سربستہ راز اور پراسرار حقیقت ہے۔ اگرچہ انسان یہ جان چکا ہے کہ غیر نامیاتی عناصر سے نامیاتی مرکبات کیسے تیار کیے جاتے ہیں لیکن یہ راز ابھی تک سینۂ قدرت میں پنہاں ہے کہ یہ نامیاتی مرکبات کس طرح زندہ خلیے بن جاتے ہیں۔

زندگی ایک سربستہ راز ہونے کے علاوہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی اور توحید کے دلائل میں سے ایک اہم ترین اور وزنی دلیل ہے۔ یہ دلیل چند مقدمات پر مشتمل ہے:

۱۔ سب پر عیاں ہے کہ مادہ ذاتی طور پر فاقد حیات یعنی ایک مردہ چیز ہے۔

۲۔ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ حیات کا منبع حیات ہی ہے۔ یعنی کسی زندگی کی پیدائش زندہ چیز سے ہی ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر گوشت کو بیرونی حیاتیاتی دنیا سے منقطع اور الگ رکھا جائے تو اس میں کوئی زندگی (کیڑوں وغیرہ کی شکل میں) پیدا نہیں ہو گی۔ خلاصہ یہ کہ کوئی بے جان چیز کسی اور بے جان کو زندگی نہیں دے سکتی۔

۳۔ ایک اور طے شدہ حقیقت یہ بھی ہے کہ زمین اپنے ابتدائی دور میں قابل حیات نہ تھی۔ اس کا درجہ حرارت اتنا زیادہ تھا کہ کسی حیات کے لیے اس پر زندگی ممکن ہی نہ تھی۔ چنانچہ سائنسی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ابتدا میں روئے زمین پر حیات نہیں تھی بلکہ بعد میں پیدا ہوئی۔

۴۔ دوسرے کرات سے زمین کی طرف زندگی کا منتقل ہونا بھی ممکن نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ شاید بعض شہاب ثاقب دوسرے کرات سے زمین میں زندگی منتقل کرنے کا سبب بنے ہوں لیکن جدید سائنسی پیشرفت نے ثابت کیا ہے کہ یہ مفروضہ غلط ہے۔ تاہم جدید تحقیقات سے اگر ثابت ہو جائے کہ زمین پر زندگی دوسرے کرات سے آ سکتی ہے تو یہی

سوال دوسرے کرات کے لیے بھی پیدا ہو گا اور وہاں بھی زندگی کا منبع لامحالہ زندگی ہی کو فرض کرنا پڑے گا۔

ان چار باتوں کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ زندگی کہاں سے شروع ہوئی؟ اور روئے زمین پر زندگی کو کس نے پیدا کیا؟

کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اس راز سے اب تک پردہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ زندگی کی کوئی توجیہ ابھی تک سامنے نہیں آئی سوائے اس کے کہ "زندگی کو اللہ نے پیدا کیا"۔

بعض اہل تحقیق اس قسم کا استدلال پسند نہیں کرتے جو مجہولات پر مبنی ہو۔ چونکہ حیات ایک سربستہ راز ہے، جب اس کے وجود میں آنے کی فزیکل توجیہ معلوم نہیں ہو سکی تو اس مجہول کی جگہ اللہ کو رکھ دیا۔

چنانچہ قدیم انسانوں کو بہت سے مظاہر قدرت کا راز معلوم نہ تھا۔ مثلاً بارش، زلزلے وغیرہ تو وہ اس مجہول راز کی جگہ اللہ کو رکھتے اور اس سے خدا کے وجود پر استدلال کرتے۔ آج راز منکشف ہونے کی صورت میں کیا یہ وجود خالق سے بے نیاز ہو جاتے؟ اگر کل راز حیات انسان پر منکشف ہو جائے تو کیا حیات وجود خدا پر دلیل نہیں رہے گی؟

ہماری نظر میں راز حیات منکشف ہونے کی صورت میں یہ راز اس بات پر بہتر اور زیادہ واضح دلیل بنے گا کہ اس تخلیق کے پیچھے ایک ذی شعور ارادہ کارفرما ہے۔

چنانچہ ۲۶ جون ۲۰۰۰ء انکشافات کی تاریخ کا اہم ترین دن قرار پایا اور دعویٰ کیا گیا کہ اس روز سینۂ کائنات میں پوشیدہ ایک راز "راز حیات" سے پردہ اٹھ گیا اور انسانی DNA میں تین ارب سالموں کی منظم ترتیب کے ذریعے جینیاتی کوڈ کا معمہ حل ہو گیا۔

تمام زندہ موجودات کے لیے جبلی ہدایات اللہ تعالیٰ نے خلیات (cells) کے مرکزی حصے DNA میں ودیعت فرمائی ہیں جو تین ارب نہایت چھوٹے سالموں پر مشتمل ہے اور حیات کا راز انہیں سالموں میں پوشیدہ ہے۔

واضح رہے انسانی جسم میں ۱۰۰ کھرب خلیات ہیں اور ہر خلیے میں ایک مرکزہ اور ۴۶ کروموسومز ہوتے ہیں۔ ہر کروموسوم ایک لمبے دھاگے کی طرح ہے جس کی لمبائی چھ قدم ہے اور اسے خیط الحیات (زندگی کی تار) کہہ سکتے ہیں۔ یہ دھاگہ ان جزئیات سے بنتا ہے جنہیں DNA یا زندگی کی بنیادی اینٹ کہتے ہیں۔ انسانی جسم کے ۱۰۰ کھرب خلیات میں موجود ان دھاگوں کو جوڑ دیا جائے تو آٹھ ہزار مرتبہ

چاند سے ہو کر واپس آ سکتے ہیں۔ ہر DNA میں تین ارب سالمے موجود ہیں جن کی ترتیب و تنظیم سے حیات وجود میں آتی ہے۔

DNA کے کئی سیکشن ہوتے ہیں جنہیں جین (gene) کہتے ہیں اور جین ہی میں وہ بنیادی نقشہ ہوتا ہے، جس پر آگے چل کر انسان کی شخصیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

انسان نے آگے جو کچھ بننا یا جس بیماری میں اسے مبتلا ہونا ہے، وہ اس جین میں کمپیوٹر کے ایک کوڈ کی طرح ملفوف ہے۔

ڈی این اے میں موجود تین ارب سالموں کی منظم ترتیب سے وجود خالق پر ایک یقینی برہان وجود میں آتی ہے۔

چنانچہ ایک مغربی مفکر اسے یوں بیان کرتا ہے:

> دس ٹوکنوں پر ایک سے دس تک نمبر لگائیں۔ پھر انہیں اپنی جیب میں ڈال کر خوب ہلائیں۔ اس کے بعد ترتیب سے جیب سے نکالیں۔ جس ٹوکن کو جیب سے نکالا گیا ہے اسے دوبارہ جیب میں ڈال کر ہلائیں پھر دوسری بار دوسرا ٹوکن نکالیں۔ اس طرح نمبر ایک ٹوکن اتفاقاً نکلنے کا امکان دس میں سے ایک ہے اور ایک اور دو نمبر ترتیب سے نکل آنے کا امکان ایک سو میں سے ایک ہے۔ ایک دو اور تین ترتیب سے نکل آنے کا امکان ایک ہزار میں سے ایک ہے۔ ایک، دو، تین اور چار کا ترتیب سے نکل آنے کا احتمال دس ہزار میں سے ایک ہے۔ ایک، دو، تین، چار اور پانچ کا ترتیب کے ساتھ نکل آنے کا امکان ایک لاکھ میں سے ایک ہے۔ اس طرح ایک سے لے کر دس تک ترتیب کے ساتھ اتفاقاً نکل آنے کا احتمال دس ارب میں سے ایک ہے۔

چنانچہ تین نمبروں کا اتفاقاً ترتیب سے آنے کا امکان کم ہونے کی وجہ سے یہی ترتیب آپ کے بریف کیس کا تالا بھی بن جاتی ہے۔

اس سادہ مثال کے بعد مسئلہ حیات پر ایک نظر ایک ڈالیں:

DNA میں موجود تین ارب سالموں کی منظم ترتیب سے حیات وجود میں آتی ہے۔

ایک سے دس تک ٹوکن اتفاقاً ترتیب سے آنے میں دس ارب میں ایک اتفاق کے حصے میں آتا ہے۔ اگر یہ ٹوکن تین ارب ہوں اور ایک سے لے کر تین ارب تک منظم ترتیب سے آنے میں اتفاق کی کوئی گنجائش قابل تصور ہے؟ اس کے بعد انسانی خلقت پر ایک نظر ڈالیں کہ انسان کئی ملین cells کی ترتیب و ترکیب سے وجود میں آیا ہے۔ یعنی اربوں ٹوکنوں کو ترتیب سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اب سوچیے کہ دس ٹوکن اتفاقیہ ترتیب سے نکل آنے کے لیے اتفاقیہ کو دس ارب میں سے ایک حصہ ملتا ہے۔ اگر یہ ٹوکن کئی ملین ہوں تو ان میں اتفاقیہ کا حصہ کیا ہوگا؟ جواب صفر ہے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ اگر ان اربوں ٹوکنوں میں سے ہر ایک ٹوکن میں موجود ٹوکنوں کی تعداد تین ارب ہو تو ان کا اتفاقاً ایک ''منظم ترتیب'' میں آنے کا امکان صفر سے کئی بار نیچے جائے گا۔ اس سے یقین آجاتا ہے کہ ان سالموں کے منظم ترتیب سے آنے میں اتفاق کا کوئی امکان نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک قصد و ارادہ کارفرما ہے۔

اتفاقیہ

آج کل کے دانشمندوں کو ریاضی، حساب سے اتفاقیہ کا امکان نہایت نامعقول نظر آنے لگا ہے اور اتفاقیہ و غیر اتفاقیہ میں فرق واضح ہوگیا ہے۔

چنانچہ پروٹین تمام زندہ خلیوں کا بنیادی مرکب ہے اور یہ پانچ عناصر سے بنتے ہیں: کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن۔ ایک پروٹین میں چالیس ہزار ایٹم ہوتے ہیں اور کیمیکل عناصر کی تعداد ۹۲ ہے۔ ان عناصر خمسہ کا ایک جگہ جمع ہونا تاکہ پروٹین کے اجزاء میں سے ایک جزء وجود میں آئے اس مادہ سے مربوط ہے جو اس کے ساتھ مخلوط ہوگا اور اس مدّت کے ساتھ مربوط ہے جو اس کے لیے لازم ہے۔

سویس (Swiss) کے ایک ریاضی دان نے ان تمام عوامل کی اتفاقاً فراہمی کا حساب لگایا تو معلوم ہوا ایک پروٹین کے ایک جزء کے اتفاقیہ وجود میں آنے کا امکان ۱۶۰۱۰ میں سے ایک ہے۔ یعنی اگر آپ ایک کو دس پر ایک سو ساٹھ مرتبہ ضرب دیں تو جو عدد ناقابل شمار سامنے آئے گا اس میں صرف ایک امکان ''اتفاقیہ'' کو مل سکتا ہے۔

ابھی پروٹین حیات پر مشتمل نہیں ہے۔ حیات کے لیے لازم سالموں کے بارے میں اتفاق کا کیا امکان ہے؟ اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

مادے کی خاصیت

نظریہ اتفاقیہ یقینی طور پر باطل ہونے کے بعد الحادی نظریے والوں نے ایک اور مفروضہ پیش کیا۔ وہ مادے کی خاصیتوں کا نظریہ ہے۔ کہتے ہیں: کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی شعور وارادے سے نہیں بلکہ خود مادے میں موجود خاصیتوں کی وجہ سے ہے۔ یہ خاصیتیں مادے میں از خود موجود ہیں۔ کسی نے یہ خاصیتیں مادے میں پیدا نہیں کیں۔

جیسے آگ کی خاصیت حرارت ہے۔ پانی کی خاصیت رطوبت ہے۔ چینی کی خاصیت شرینی ہے وغیرہ۔

جواب: یہ نظریہ بھی نظریہ اتفاقیہ سے کم نامعقول نہیں ہے۔ اس نظریہ میں مواد کی ہر خاصیت کا ذکر کافی نہیں کیونکہ مواد میں ہر ایک کی اپنی جگہ خاصیت ضرور ہے لیکن یہاں سوال آتا ہے کہ یہ مواد آپس میں ترکیب پاتے ہیں تو مشترکہ خاصیت بروئے کار کیوں لاتے ہیں؟

ایک دکان میں انواع واقسام کی سبزیاں یا میوے و مصالحاجات موجود ہیں۔ ان سب کو ایک دیگ میں ڈالنے سے اتفاقاً ایک منفرد طبی نسخہ تیار ہوجائے گا اور کوئی حکیما ہدنہ ف حاصل کر لے گا؟ ہرگز نہیں۔

لیکن جہاں ان مواد کی ترکیب حکیمانہ قصد وارادے کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہے تو وہاں ان مواد میں سے ہر ایک دوسرے سے جڑ کر ایک مقصد پورا کرتا ہے۔ ایک ضرورت وغرض کی تکمیل ہوتی ہے اور ایک موجود کے مستقبل کو تابناک بناتے ہیں۔

مادہ کی خاصیت میں مستقبل کی فکر کہاں سے آگئی؟ چونکہ خاصیت موجودہ حالت سے مربوط ہے۔ مستقبل جو ابھی آیا نہیں ہے اس کا خاصیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ یہ ترکیب جب ایک حکیمانہ قصد و ارادے سے وقوع پذیر ہوتی ہے تو ان مواد کا آپس میں نہایت توازن، ربط، تعادل اور تعاون ہوتا ہے۔ پانی، دھوپ، ہوا اور خاک مل کر انسان کے لیے سامان زیست فراہم کرتے ہیں۔

ایک اور مثال سے مزید واضح ہوگا: جرثومہ پدرتخم مادر سے جفت ہوتا ہے اور حمل ٹھہر جاتا ہے۔ ادھر ماں کے سینے میں آنے والے بچے کے لیے ایسی غذا کا اہتمام ہوتا ہے جو بچے کی عمر، صحت اور معدے کے لیے نہایت گوارا اور مفید ہے۔ یہ بچہ ابھی وجود میں نہیں آیا۔ اس کے آنے سے پہلے ماں کے سینے میں دودھ کا اہتمام اور ناتواں بچے کے منہ سے دودھ چوسنے کے لیے نہایت موزوں سوراخ ہوتا ہے۔

مادے میں بچے کے مستقبل کی فکر اور بچے کے آنے سے پہلے اس کی ضروریات کے اہتمام کا احساس کہاں سے آتا ہے؟ اندھے مادے سے مستقبل کی فکر، ناممکن ہے۔

ایک اور مثال سے مزید وضاحت ہو جائے گی:

مثلاً حروف ص، ر، ا، ط، ع، ل، ی، ح، ق، میں سے ہر ایک حرف کی اپنی جگہ ایک آواز ہے۔ص کی اپنی آواز ہے اور س کی بھی اپنی آواز ہے۔ ان انفرادی آوازوں سے کوئی مطلب نہیں بنتا لیکن یہ حروف قصد وارادے سے جوڑے جائیں تو یہ عبارت بن جاتی ہے: صراط علی حق اور اگر ان حروف کو قصد وارادے کے بغیر اندھا دھند ملایا جائے تو طارص یلع قح جیسی بے معنی عبارت بنتی ہے۔ جب ایک مختصر جملہ از خود جڑ کر نہیں بن سکتا تو اس کائنات میں کھربوں حروف کے از خود جڑنے سے محیر العقول کرشمہ سازی کیسے ہو سکتی ہے؟!

نیچر (فطرت) دلیل توحید

اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی قدرت، حکمت اور اپنی مخلوق سے محبت پر بہتر دلیل اس کی مخلوق ہے۔مخلوقات کی ہر چیز میں مقصد، حکمت، ارادہ کار فرما ہے اور کسی اندھی قوت کا یہاں کوئی نشان نہیں ملتا۔ پوری کائنات کا نظام قانون، قصد اور حکیمانہ ارادے پر قائم ہے۔ یہاں کوئی مقصد بغیر قصد کے، کوئی مراد بغیر ارادے کے نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔کائنات کے کسی گوشے میں لاقانونیت، بے نظمی اور اندھے پن کا شائبہ نہیں ہے۔

نیچر اور تنظیم

کسی چیز کو منظم کرنے کا مطلب ہے: مختلف اجزاء کو اس طرح سے جوڑا جائے جس سے مطلوبہ مقصد حاصل ہو۔ مثلاً گاڑی میں مختلف پرزے جوڑتے ہیں تاکہ اس پر سفر کیا جا سکے۔

کیا کائنات میں بھی قصد اور تنظیم موجود ہے؟ کیا پرندوں کی پرواز میں کوئی تنظیم ہے؟ اس پر ہم کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

پرندوں میں مقصد پرواز ہے۔ اس مقصد کے لیے پرندے کی ہڈیاں اندر سے خالی اور ہلکی بنائی گئی ہیں اور سینے کے عضلات مضبوط بنائے گئے ہیں تاکہ سینے کی ہڈیاں اور پر مل کر ہوا میں توازن برقرار رکھ سکیں۔ چنانچہ پرندے کے پر ہوا کے تقاضوں کے مطابق بنائے گئے اور مطلوبہ طاقت بھی فراہم کر دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پرندہ خاص مقصد کے تحت تیار کیا گیا ہے۔

ہم دور کیوں جائیں! آپ اپنے دونوں ہاتھ اس نظر سے دیکھیں کہ یہ چیزیں کیسے پکڑتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں چیزیں کیسے دیکھتی ہیں۔ آپ کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس مقصد کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ تنظیم نہیں ہوسکتا۔

پلازما (Plasma) کی خدمات

پلازما ایک زرد سیال ہے جو جسم کے کل خون کے حجم کا تقریباً پچپن فیصد بنتا ہے۔ اس سیال میں نوے فیصد پانی ہوتا ہے۔ پلازما نمک، معدنیات، شوگر، چربی و دیگر بہت سی پروٹین پر مشتمل ہے۔ خون کی بعض پروٹین دیگر مقامات میں چکنائی منتقل کرتی ہیں۔ اگر یہ پروٹین چکنائی منتقل نہ کریں تو یہ چکنائی ہر جگہ بدنظمی پیدا کرے گی اور ناقابل علاج بیماریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔

نہایت قابل توجہ ہے کہ پروٹین میں یہ سوجھ بوجھ ہے کہ وہ ''دھون''، ہارمون اور دوائی میں فرق پہچان لیتی ہیں۔ اس قسم کی دیگر ہزاروں مثالیں ہمارے جسم میں ہیں۔

۱۔ تحول انواع کا نظریہ اس وقت قائم کیا گیا جب لوگ جینیاتی دنیا سے بے خبر تھے۔ چنانچہ تمام زندہ موجودات کے جین میں ہی نقشہ ہوتا ہے۔ ہر شیء کی خاصیت جین میں ملفوف ہوتی ہے۔

۲۔ کائنات کا نظام اس قدر کلی قانون کے تحت چل رہا ہے کہ چاند، سورج گرہن کی صدیوں پہلے پیشگوئی کی جاسکتی ہے۔

۳۔ ایٹم ہم نے ابھی تک نہیں دیکھا پھر بھی اس کی ترکیب وقوانین پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم صرف اس کے آثار سے اسے پہچانتے ہیں اور منطقی دلیل سے اس کی بات کرتے ہیں۔

۴۔ فکر کے مادی اوصاف نہیں ہوتے کہ اس کا کوئی طول وعرض، وزن، رنگ، اس کی شکل و صورت ہو۔

۵۔ سائنسی علوم تجرباتی ہوتے ہیں، پھر بھی انسان کے اپنے خیالات و اوھام سے متاثر ہوتے ہیں اور نتیجہ اخذ کرنے میں کوتاہی ہوتی ہے اور یہ احتمالات سے شروع اور احتمالات پر ختم ہوتے ہیں، یقینی نہیں ہوتے۔ چنانچہ سائنسی نتائج میں غلطی کا امکان رہ جاتا ہے اور حرف آخر نہیں ہوتے۔ چنانچہ سائنسدانوں کو یہ کہتے سنتے ہیں:

''یہ وہ بات ہے جس تک ہم پہنچے ہیں اور آئندہ کے لیے مزید تحقیق کی گنجائش ہے۔''

تمام سائنسی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ مادہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، اس کی تمام

کیفیات بے نظم اندھا دھند نہیں بلکہ کلی قانون کے تحت ہیں۔

بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قانون کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کے اسباب کا ابھی انکشاف نہیں ہوا ہوتا، اس کے باوجود سائنسدان اس قانون پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ اگر یہ اتفاقی ہے، منظم قانون نہیں ہے تو معقول نہیں کہ سائنسدان اس پر پورا اعتماد کریں۔

سائنسدانوں نے عناصر کی ترکیب کے بارے میں ایک قانون کا انکشاف کیا اور اس قانون کے تحت ایک حلقہ عنصر نظر نہیں آیا۔ قانون کی روشنی میں اس عنصر کے موجود ہونے کی پیشگوئی کی گئی اور پیشگوئی کے مطابق اس عنصر کا انکشاف ہو گیا۔

اس طرح یہ انکشاف بھی ہوا کہ عناصر کا آپس میں جوڑ ہے۔ مثلاً عنصر ''الف'' عنصر ''ب'' سے جڑتا ہے لیکن عنصر ''ج'' سے نہیں کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ عنصر ''الف'' اور عنصر ''ب'' کے درمیان کشش موجود ہے جب کہ یہ کشش عنصر ''ج'' میں نہیں ہے۔

انسان کا کائنات کے بارے میں جستجو کرنا اور آئے دن راز ہائے نہاں منکشف ہونا اور یہ تاثر کہ ابھی بہت کچھ انسان کو معلوم نہیں ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ اگر کائنات کی ہر چیز اور ہر قانون پر ایک بڑی طاقت کے حاکم ہونے پر عقیدہ نہ ہوتا تو انسان حقائق کے انکشاف کی خاطر اپنی عمر ضائع نہ کرتا۔ اگر تحقیق کا نتیجہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ اور نکلتا تو اس بدنظمی میں کوئی نتیجہ نہ ملتا۔

ماہر طبیعیات پاؤل کلیرنس کہتے ہیں:

> سائنس اپنی تحقیقات نہایت کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہے مگر ایٹم، کائنات اور عقل کی تفصیلات میں بہت سی مشکلات حل کرنے سے عاجز ہے۔ سائنسی وسائل اگرچہ ہمیں یہ بتانے میں کامیاب نظر آتے ہیں کہ اشیاء کس طرح وجود میں آتی ہیں لیکن یہ بتانے سے عاجز ہیں کہ یہ اشیاء کیوں وجود میں آتی ہیں۔
>
> انسانی عقل اور سائنس یہ بتانے سے عاجز ہے کہ اشیاء کیوں موجود ہوتی ہیں اور نہ یہ بتا سکتی ہے کہ ایٹم، ستارے اور حیات کیوں پیدا ہوئی؟ باوجودیکہ سائنس سوڈیم، کہکشاؤں، ستاروں اور ایٹم کی پیداوار کے بارے ہمیں قیمتی معلومات فراہم کرتی ہے، سائنس یہ نہیں بتا سکتی کہ مادہ اور انرجی کا منبع کیا ہے جو اس کائنات کی تخلیق میں استعمال کیا گیا اور اس سے کائنات نے موجودہ صورت اختیار کی۔ لہٰذا حق یہ ہے کہ صحیح

سوچ اور درست استدلال ہماری عقل کو اللہ کے وجود کا قائل ہونے پر مجبور کرتا ہے۔[1]

ماہر طبیعیات اروین فیسٹ کہتے ہیں:

جن عناصر سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے، وہ پروٹونز سے شروع ہوتے ہیں جن میں مخصوص خاصیتیں اور کشش ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں لیکن یہ پروٹونز کیسے پیدا ہوئے اور ان میں یہ خاصیتیں کیوں ہیں؟ سائنس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔[2]

ماہر کیمیا تھامس ڈیوڈسن (Thomas Davidson) کہتے ہیں:

میں ان موجودات میں اللہ کی تخلیق و تدبیر ہی نہیں محسوس کرتا بلکہ یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس خالق کو اپنی مخلوق سے کس قدر محبت ہے اور اپنی مخلوقات کے امور کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔[3]

کائنات کا نظم اور قوانین طبیعت، سائنس کی بنیاد ہیں۔

ماہر جیالوجی ڈاؤسن (Dawson) کہتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے کائناتی قوانین پر ایمان لانا ضروری ہے تاکہ عبادت اور دعا ہو سکے۔ اس لیے کہ اگر کائنات کا کوئی نظام نہ ہو یا یہ کہ معاملہ حتمی ہو اور تبدیلی کی کوئی گنجائش نہ ہو تو انسان کی عبادت اور دعا بے معنی ہو جاتی ہے لیکن انسان اگر یہ عقیدہ رکھے کہ یہ کائنات نہ صرف ایک کنٹرول کرنے اور چلانے والے کے ہاتھ میں ہے بلکہ ایک حکیم اور مہربان ذات کے اختیار میں ہے تو اس صورت میں ہم عبادت اور دعا کر سکتے ہیں۔ اس امید سے نہیں کہ وہ اپنے کائناتی قوانین میں تبدیلی لائے بلکہ ہم اس لیے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی وسیع حکمت، ہم سے محبت کے تحت تدبیر کائنات میں ایسی تقدیر بنائے جس سے ہماری حاجتیں برآئیں۔[4]

مشہور کیمیا دان جان ایڈولف بوھلر (John Adolf Boehler) کہتے ہیں:

[1] اللہ يتجلى فى عصر العلم
[2] حوالہ سابق
[3] حوالہ سابق
[4] حوالہ سابق

شواہد کے مطابق کائنات میں کیمیکلی وحدت پائی جاتی ہے اور ہمارے پاس ایسے وسائل ہیں جن سے ہم دوسرے ستاروں میں موجود عناصر کا بھی کھوج لگا سکتے ہیں اور یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ دیگر سیاروں میں بھی عیناً وہی عناصر ہیں جو زمین میں ہیں حتیٰ دورترین سیاروں میں بھی وہی عناصر ہیں جو زمین میں ہیں۔

سائنسدانوں کا نظریہ ہے کہ جو طبیعی قوانین زمین پر حاکم ہیں عیناً وہی قوانین فضائے کائنات کے دور دراز علاقوں میں پائے جانے والے سیاروں میں بھی ہیں۔

مجھے امید تھی کہ مجھے اتنا وقت میسر آئے گا کہ میں اس کائنات پر حاکم محیر العقول خلاقیت اور یہاں موجود نظام کی عظمت کی مثالیں پیش کرسکوں گا مگر میں چاہتا ہوں قاری اس بات کی طرف توجہ کریں کہ پانی، آکسیجن اور کاربن ڈائی اکسائڈ کے سرکل میں کیا کیا حکمت و تدبیریں موجود ہیں۔ [1]

پاؤل ارنسٹ اڈولف (Paul Ernst Adolf) :

دقیق شماریات سے معلوم ہوا ہے مختلف بیماریوں کے اسّی فیصد مریضوں کی بیماروں کا اصل سبب نفسیاتی ہے۔

دوسری جگہ کہتے ہیں:

انسان کا جسم اس وقت اپنی اصلی حالت میں صحت مند رہ سکتا ہے جب اپنے خالق کے ساتھ ہو۔ اس کے بغیر وہ اضطراب اور بیماریوں میں مبتلا ہو گا۔ وہی ذات ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور شکستہ دلوں کو جوڑتی ہے۔ [2]

حضرت آیۃ اللہ محسنی دام ظلہ العالی کی کتاب عجائب و مطالب میں اتفاقیہ کے موضوع پر ان کی تحریر کا خلاصہ یہاں ذکر کرتے ہیں:

حقیقتاً ملحدین اور مادہ پرست بدترین اشتباہ اور بے عقلی میں مبتلا ہیں۔

آپ درج ذیل سطور کا مطالعہ کریں تا کہ اسرار طبیعت سے آشنا ہو کر لذت حاصل کریں اور ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کی لامتناہی حکمت، علم اور قدرت پر ایمان مستحکم ہو

---

[1] حوالہ سابق
[2] حوالہ سابق

جائے:

۱۔ انسان کی آنکھ ۱۷ ہزار رنگوں کی تشخیص کر سکتی ہے۔

۲۔ صرف آنکھوں میں ۱۳۵ ملین حساس سیلز ہوتے ہیں جن کے ذمے تصویر لینا اور رنگوں کی تشخص کرنا ہے۔

۳۔ انسان کا دل نہایت طاقتور قدرتی پمپ ہے جو ایک منٹ میں ۶۰ سے ۸۰ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ روزانہ اوسطاً ایک لاکھ مرتبہ دھڑکتا ہے۔

۴۔ دل اپنی ہر دھڑکن میں ۱۲۰ لیٹر خون پمپ کرتا ہے اور تیز دوڑنے کی صورت میں ۱۸۰ تک پہنچ جاتا ہے۔

۵۔ دل خلیوں تک آکسیجن پہنچاتا اور کاربن ڈائی آکسائڈ پھیپھڑوں کی طرف روانہ کرتا ہے۔

۶۔ گردش کے دوران خون غذائی مواد تقسیم کرتا ہے اور زائد مواد بدن سے خارج کر دیتا ہے۔

۷۔ خون کو جسم میں رفت و آمد کے لیے ۸ سکینڈ درکار ہوتے ہیں۔ خون کے لیے لمبا سفر پاؤں کی انگلیاں کا ہے یہاں تک خون ۸ سکینڈ میں آکر واپس دل میں چلا جاتا ہے۔

۸۔ انسان نے اب تک جگر کی ۵۰۰ خدمات کا انکشاف کیا ہے جو جسم کو زندہ رکھنے کے لیے انجام دیتا ہے۔ ان خدمات کی فراہمی رکنے کی صورت میں ۸ سے ۴۲ گھنٹوں میں انسان اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۹۔ انسان کا دماغ جسم میں جذب شدہ آکسیجن سے ۲۰ فیصد جذب کرتا ہے۔

۱۰۔ اعصاب پیغامات ۱۷۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پہنچا دیتے ہیں۔

۱۱۔ خون ۹۲ فیصد مغز، ۷۵ فیصد عضلات، ۷۵ فیصد پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۲۔ انگوٹھا، زبان کی تاثیر، آنکھوں کے عدسے تمام انسانوں میں مختلف ہوتے ہیں۔

۱۳۔ اعضائے بدن میں ''زبان'' زیادہ طاقتور ہے۔

۱۴۔ انسان دس ہزار بو سونگھ سکتا ہے۔

۱۵۔بعض انسانی رگیں بال سے پچاس گنا باریک ہوتی ہیں۔
۱۶۔انسان کی جلد دو مربع میٹر ہے۔
۱۷۔انسان کے دندان چٹان سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔
۱۸۔ ہر انسان ۲۴ گھنٹوں میں ۲۲ ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے۔
۱۹۔صرف انسان پشت پر سو سکتا ہے۔
۲۰۔انسان کے معدے میں ۳۵ ملین ہاضمے کے غدود ہوتے ہیں۔
۲۱۔انسان کے ڈی این اے میں ۸۰ ہزار جین ہوتے ہیں جن میں تمام انسانی صفات ملفوف ہوتی ہیں۔

اتفاقیہ اندھا ہوتا ہے۔ نہ اس کے پاس شعور ہے نہ حافظہ ہے نہ وجدان نہ قصد ہے نہ مقصد۔ ایک سے دس تک ٹوکنوں کے ترتیب سے آنے میں دس ارب میں سے ایک احتمال ہے۔یعنی اگر ہم نے ان ٹوکنوں کو دس ارب مرتبہ نکالیں تو ایک بار ترتیب سے نکلنے کا احتمال ہے۔

فرض کرتے ہیں ایک بہت بڑا دوا خانہ ہے جس میں ہر قسم کی دوا، معجون، شربت وغیرہ موجود ہیں۔ اتفاق سے زلزلہ آتا ہے اور یہ ساری دوائیں آپس میں مکس ہو جاتی ہیں اور مختلف نسخے اتفاقاً جڑ جاتے ہیں اور ایک لا علاج مرض کی دوائی وجود میں آ جاتی ہے اور اگر یہ نسخہ ایک زندہ خلیے یا کسی زندہ چیز خواہ نبات ہو یا حیوان کو اتفاقاً تشکیل دے۔ یہ ایسا محال ہے جو قابل بحث نہیں ہے۔

اسے ہم قانون احتمالات کہہ سکتے ہیں جو اس مقام پر محالات میں ہے۔

عناصر کی ترکیب

عناصر کی ترکیب میں معمولی فرق آنے سے ایک اور مختلف چیز وجود میں آتی ہے۔ مثلاً کولیسٹرول (Cholesterol) ہمارے جسم میں چکنائی کی ایک قسم کی ضرورت پوری کرتا ہے لیکن اس کی ترکیب میں معمولی فرق آنے سے یہ انسانی جسم میں جادوئی قسم کا کردار ادا کرتا ہے۔کبھی یہ خون میں چکنائی پیدا کر کے خون کا پریشر بڑھا دیتا ہے اور جب اس میں معمولی سا ترکیبی فرق میں آتا ہے تو ایسے ہارمونز تیار کرنے شروع کر دیتا ہے جو انسان کے جسم میں بال اگاتے ہیں جیسے داڑھی مونچھ۔ آواز موٹی کرتا اور عضلات میں مضبوطی لاتا ہے لیکن جب اسی کے بعض ذرات میں تبدیلی آتی ہے تو زنانہ خاصیتیں پیدا کرنی شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً آواز باریک کرنا، جلد کی نرمی وغیرہ

جب اس کی ترکیب میں معمولی سا فرق آتا ہے تو یہ وٹامن ڈی ایس (Vitamin DS) بنانا شروع کر دیتا ہے جو آنتوں سے کلکس (Clicks) چوس کر ہڈیوں پر ڈال دیتا ہے تاکہ ہڈیاں مضبوط ہو جائیں۔ اس میں ایک ذرے کا فرق آنے پر یہ ایسڈ زیرو (Acids zero) بناتا ہے جو جگر سے مترشح ہو کر آنتوں کو غذا جذب کرنے کے قابل بناتا ہے۔

دماغی اعصاب کے خلیے (Mental Nerve Cells) : ان کی شکل دوسرے خلیات سے مختلف ہے۔ وہ کبھی پاؤں والے کیڑے، کبھی بے پتے درختوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ان دماغی خلیوں میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ یہ ادراک، فکر، حکمت، تصور، خیال، زیرکی، ارادے اور شخصیت کے مالک ہوتے ہیں جب کہ دوسرے خلیات کی طرح ہی ہیں۔ یہ بھی باقی خلیوں کی طرح غذا لیتے ہیں۔ ترکیب، داخلی کروموسومز وغیرہ میں دوسروں کی طرح ہیں۔ سائنس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

حرکت قلب

دل اوسطاً ایک منٹ میں 70، ایک دن میں ۱۰۰۰۰۰ ، ایک سال میں ۴۰ ملین اور متوسط عمر میں ۲۰۰۰ ملین مرتبہ دھڑکتا ہے۔

یاد۔ ذاکرۃ

جسم میں تمام خلیات بدل جاتے ہیں۔ خلیات کی عمریں ہوتی ہیں سوائے دماغی خلیات کے۔ اگر یہ بھی بدل جائیں تو ہمیں ہر چھ ماہ بعد زبان سیکھنی پڑے۔

دماغ

دماغ میں ایک ہزار ملین اعصابی سیلز (خلیے) موجود ہیں اور دماغ سے اعصابی رگیں پورے جسم میں پھیل جاتی ہیں۔ ان اعصابی رگوں کے ذریعے مملکت جسم کے کسی علاقے میں رونما ہونے والے چھوٹے بڑے واقعات کی دماغ کو اطلاع ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار کی سرعت سے پہنچائی جاتی ہے۔

چنانچہ حاسۂ ذائقہ کے تین ہزار شعیرات (Bristles) دماغ کے ساتھ متصل ہیں جو ہر ذائقے کی فوری اطلاع دماغ کو دیتے ہیں۔

حس سماعت میں دس ہزار خلیے کام کرتے اور دماغ تک آواز پہنچاتے ہیں۔

حس بصارت میں ایک سوتیس ملین خلیے سامنے آنے والی ہر صورت شکل دماغ تک پہنچاتے ہیں۔

حس لمس کے لیے ہماری جلد کے ساتھ باریک اعصاب کا جال بچھا ہوا ہے۔ اگر ہماری جلد کو کوئی گرم چیز چھو لے، تیس ہزار خلیے اس حرارت کا احساس دماغ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگر کوئی ٹھنڈی چیز

چھو جائے تو دو لاکھ پچاس ہزار خلیے اس ٹھنڈک کو دماغ تک پہنچا دیتے ہیں۔

تازہ انکشافات میں آیا ہے:

سائنسدانوں نے دیکھا کہ کائنات جب گرم گیس اور غبار کی شکل میں تھی، آواز کی لہریں نکال رہی تھی اور اس آواز میں کوئی شدّت اور رعونت نہ تھی بلکہ اس وقت کائنات کی آواز نہایت آرام کی تھی جیسے شیر خوار بچے کی آواز ہے۔[1]

اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا...۔[2]

کیا کفار اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ یہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کر دیا ہے...؟

خطاب کافروں سے ہے۔ مؤلف ''اسرار الکون'' کہتے ہیں:

چونکہ اس رتق و فتق سے کافروں نے باخبر ہونا تھا اس لیے کافروں سے خطاب فرمایا۔

جیسا کہ فرمایا:

قُلۡ اَئِنَّکُمۡ لَتَکۡفُرُوۡنَ بِالَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ...الخ[3]

کہہ دیجیے: کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا...۔

سائنسی نظریہ اور قرآن

قرآن کو سائنسی انکشافات پر تطبیق کرتے ہوئے ذمے داری سے کام لینا ضروری ہے۔

کچھ حضرات سائنسی انکشافات پر قرآن کی آیات کی تطبیق کرتے ہیں جب کہ ایک طرف قرآن کی صراحت موجود نہیں ہے، دوسری طرف تجربہ ابھی تھیوری کے مرحلے میں ہے۔ ابھی ایک حقیقت کے طور پر سامنے نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ کل یہ تھیوری غلط ثابت ہو۔

لہٰذا قرآنی علوم کی تطبیق تجرباتی علوم پر کرنے کے لیے دو باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

پہلی یہ کہ اس موضوع پر قرآنی صراحت موجود ہو۔

دوسری یہ کہ تجرباتی علوم تھیوری کے مرحلہ میں نہ ہوں۔ ایک حقیقت کے طور پر مسلم ہو چکے ہوں۔

---

[1] اسرار الکون بین العلم و القرآن
[2] سورۃ الانبیاء: ۳۰
[3] سورۃ فصلت: ۹

ہمارے بعض معاصر اہل قلم نے نظریہ اضافت اور نظریہ بگ بینگ (Big Bang) کی قرآنی آیات پر تطبیق کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک خطرناک غلطی ہے۔

چنانچہ آئن سٹائن کے نظریہ ''روشنی کی رفتار مستقل ہے'' کو لندن کے امپریل کالج کے سائنسدانوں نے چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ روشنی کی رفتار تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ جب کہ آئن سٹائن کا نظریہ ''روشنی کی رفتار مستقل ہے'' کئی برسوں تک سائنسی کامیابیوں کی بنیاد سمجھا گیا ہے۔

عقل

حیوانات میں مزاج وطبیعت اور خواہشات ہیں مگر عقل نہیں ہے۔

ابتداء میں فرزند آدم قابیل کو اپنے بھائی کا مردہ جسم چھپانے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ کوے کو آتا تھا۔ آج انسان عقلی ارتقاء کے اوج پر ہے مگر کوا آج بھی اسی منزل پر ہے۔ اس میں کوئی ارتقا نہیں ہے۔

انسان اس کائنات میں اللہ کا عظیم معجزہ ہے۔ دیگر تمام جاندار وغیر جاندار انسان کے لیے مسخر ہیں لیکن انسان کسی اور مخلوق کے لیے مسخر نہیں ہے۔ انسان کو اس کائنات میں برتری حاصل ہے۔ اس کی وجہ عقل ہے۔ عاقل انسان کو برتری حاصل ہے۔ انسان نے اپنے عقلی اقتدار سے بہت سی چیزوں پر اپنا اقتدار قائم کیا ہے۔ اس نے پانی بہنے کی طاقت کو قابو کیا۔ بخار، گیس اور بجلی کی طاقت اپنے کنٹرول میں لی۔ ہاتھوں کی جگہ مکینیکل (Mechanical) آلات ایجاد کیے۔ مسافتیں طے کرنے کے لیے تمام تیز رفتار جانوروں سے زیادہ سرعت کے ذرائع ایجاد کیے۔ پرواز کی نوبت آئی تو پرندوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اسی طرح تسخیر طبیعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کیا یہ سب اتفاقیہ ہے؟!

نظریہ ارتقا

ڈارون کے نظریے کو اس وقت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب ماہرین آثار قدیمہ نے کھدائی کے ذریعے ارتقائی مراحل تلاش کیے جو ڈارون کا نظریہ ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی کہ تخلیق دفعتاً ہوئی ہے۔

چنانچہ ارتقائی نظریہ کے حامل ماہر آثار قدیمہ مسٹر ڈبلیو ایگر ڈریک (W.AgerDerek) نے کہا ہے:

> جب منجمد زندہ موجودات کا کھوج لگایا تو ہمیں یہ مشکل پیش آئی کہ ہم نے زندہ موجودات کو کامل صورت میں دیکھا۔ یہ تمام انواع و اصناف میں پایا گیا۔ ہم نے کہیں بھی ارتقائی مراحل اور تدریجی تخلیق کا مشاہدہ نہیں کیا۔ یعنی منجمد موجودات ہم

نے دیکھیں۔ یہ سب کامل صورت میں دفعتاً خلق ہوئی ہیں، تدریجاً نہیں۔

چنانچہ مشہور زولوجسٹ ''لارڈ ذکرمین'' (LordZuckerman) جن کا منجمد احیاء پر تحقیقاتی مرکز بھی ہے، نے پندرہ سال جنوبی منجمد بندروں پر تحقیق کی ۔ انہیں اپنی تحقیقات میں انسان اور بندروں میں کوئی حلقہ اتصال نہیں ملا اور ڈارونی نظریہ رکھنے کے باوجود اس نے اس بات کا اعتراف کیا۔

ایک سوال: کیا سائنسدانوں نے آج تک کوئی ایسی مثال پیش کی ہے کہ سائنسی تحقیقات کی بنیاد غیر مضبوط، غیر منظم اور قانون و انضباط کے بغیر کسی نتیجے پر پہنچی ہو؟

کیا مادہ اور انرجی پر مشتمل طبیعات عالم میں کوئی نظام، کوئی قانون نہیں ہے!؟

یہ سب اندھا دھند غیر منظم اتفاقات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ سائنسدانوں نے عناصر کی ترتیب کا مشاہدہ کیا اور اس ترتیب و تنظیم کے مطابق عناصر کا ایک حلقہ مفقود پایا اور بعد میں اس عنصر کا انکشاف ہوتا ہے۔

چنانچہ ایٹم کی ترکیب اور ان میں موجود کیمیکل تعامل و تفاعل اور ان کی ہر خاصیت سب ایک قانون کے تحت ہے اور کسی جگہ اتفاقیہ اور بے نظمی نظر نہیں آتی۔

آئن سٹائن کہتے ہیں:

> جو شخص سنجیدگی سے سائنس پڑھتا ہے جلد ہی اسے یقین ہو جاتا ہے کہ ایک روح اور ایک بڑی ہستی دنیا کے قوانین کے پیچھے ہے جو انسان سے بہت اعلیٰ ہے۔ ایک سائنس دان کے مذہبی جذبات ولولہ انگیز شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ قدرت کے قوانین کس قدر ہم آہنگ اور اعلیٰ ہیں اور یہ نظام اس قدر اعلیٰ ہے کہ اس کے مقابلے میں انسان کی عقل و فہم اور سمجھ بوجھ نہایت حقیر ہے۔[1]

[1] ملاحظہ ہو: The World as I See It

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۔ (سورۃ التین: ۴)

بتحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ کا عظیم معجزہ

تخلیق انسان

دنیائے خلیات

خلیاتی دنیا کا مطالعہ اہم ترین ہے جس میں کائنات میں پوشیدہ اللہ کے ناقابل وصف و بیان معجزات ہیں۔ اس میں:

اللہ تعالیٰ کی صناعیت پر بہت بڑا درس توحید موجود ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کی محیّر العقول آیات بینات موجود ہیں۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی لامحدود قوت و طاقت کا نظارہ موجود ہے۔

اس میں پنہاں عظمت، اطراف کائنات پر محیط کہکشاؤں کی عظمت سے کم نہیں ہے۔

حجم میں اتنا چھوٹا کہ انسان کے حاسۂ بصر میں لانے کے لیے اسے دس لاکھ گنا بڑا کرنا پڑتا ہے اور حکمت و قدرت الٰہی کے مظاہر میں اتنا بڑا کہ اس کی خلقت و جبلت کا مطالعہ کرنے سے انسانی عقول عاجز و درماندہ ہیں۔ یہ تعمیر کائنات کی خشت اوّل اور تشکیل حیات کا دمِ اول ہے۔

اس ناقابل رویت خلیے (Cell) میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار آیات ہیں۔ لفظ ''بے شمار'' سے یہ تاثر نہ لیا جائے کہ یہ مبالغہ یا محاورہ ہے بلکہ یہ مبنی بر حقیقت ہے۔

آیئے! ہم ایک ممکنہ جائزہ لیتے ہیں کہ اس چھوٹی سی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی کیا کیا نشانیاں پنہاں ہیں۔ ان نشانیوں میں خلیہ کے صرف ایک شعبے DNA کی دولڑیوں کی بات کرتے ہیں جو تین ارب سالموں پر مشتمل ہیں اور سائنسدانوں کے بقول ان تین ارب سالموں کی منظم ترتیب میں راز حیات مضمر ہے۔

انسانی جسم اگر سو ارب خلیات پر مشتمل ہے اور ہر خلیے کا ایک شعبہ DNA تین ارب سالموں پر مشتمل ہے تو سو ارب کو تین ارب سے ضرب دیں تو ایک خیالی عدد سامنے آتا ہے جو خلیے کے ایک شعبے کا ہے۔

اس اہمیت کے دوسرے بہت سے شعبے ہیں۔ ہم ان شعبوں میں سے چند ایک کا ذکر کتاب جسم کے عجائبات[1] و دیگر کتب سے اقتباسات کی صورت میں کرتے ہیں۔

[1] ترجمہ و ترتیب محترم محمد علی سید

۱۔ شعبہ پاور پلانٹ

ہمارے جسم کے ہر خلیے میں کم و بیش ایک ہزار توانائی گھر شب و روز بلا وقفہ کام کرتے ہیں۔ یہ پاور پلانٹ ضروری توانائی حاصل کرنے کے لیے خون میں موجود شکر بطور ایندھن استعمال کرتے ہیں۔ ایندھن کا فضلہ پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی صورت میں بچتا ہے۔

جسم کو ہر وقت توانائی کی ضرورت ہے۔ مثلاً دل کی دھڑکن، سانس لینے اور آنکھوں کی پلکیں جھپکنے کے لیے توانائی ضروری ہے۔

مقام تعجب ہے یہ توانائی جسم کے مختلف خلیات اپنی ضرورت کے مطابق پیدا کرتے ہیں۔ کشورتن میں توانائی کی کمی کا نتیجہ فالج یا موت کا شکار ہونا ہے۔ انسان اگرچہ گہری نیند سو جاتا ہے لیکن اس کے جسم کی انتظامیہ بیدار اور مستعد تمام توانائی گھروں میں مصروف عمل رہتی ہے اور جسم کو ضرورت کی حرارت فراہم ہوتی رہتی ہے۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کی جو بھی حالت ہو یہ پاور پلانٹ بلا تعطل اپنی ڈیوٹی دے رہے ہوتے ہیں۔

۲۔ شعبہ کیمیکل پلانٹ

خلیے میں چھ سو (۶۰۰) کیمیکل پلانٹ ہوتے ہیں۔ جو اینزائمز (enzymes) یعنی خامرے کہلاتے ہیں۔ یہ ایسے حیاتیاتی کیمیائی اجزاء ہیں جو تمام حیوانوں اور پودوں میں پائے جاتے اور تمام کیمیائی تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں۔ یہ کیمیادان DNA کے آلہ کار RNA کی ہدایت پر اپنا کام کرتے ہیں۔

آپ جو کھانا کھاتے ہیں اینزائمز اس سے پروٹین حاصل کرتے ہیں، پھر اس کی ترتیب بدل کر دوسری ترتیب میں اسے منظم کرتے ہیں۔ ترتیب کی اس تبدیلی سے کھانے کی پروٹین انسانی پروٹین بن جاتی ہے۔

یہ کیمیادان نہایت اہمیت کے حامل پراسرار ہارمونز تیار کرتے اور بیماریوں کے خلاف جسم کے دفاعی نظام میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

بیماریوں کے خلاف لڑنے والی فوج اینٹی باڈیز کی تیاری اور حالت جنگ میں دفاعی فوج کی مسلسل فراہمی بھی انہی اینزائمز کی ذمہ داری ہے۔ ان کے علاوہ یہ اینزائمز بے شمار ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیتے ہیں جن کے بارے میں دنیا کے عظیم کیمیادان ابھی سوچ بھی نہیں سکتے۔

اینزائمز کے محیر العقول کارناموں میں سے ایک حیرت انگیز کارنامہ ہارمونز کی تیاری ہے۔ ہارمونز کو کیمیائی پیغام رساں کہہ سکتے ہیں۔ یہ پیغام رساں برق رفتاری سے جسم کے طول و عرض میں

دماغ کی ہدایات پہنچاتے ہیں۔ مثلاً اگر جسم میں بلڈ شوگر بڑھ رہی ہے تو انسان کا لبلبہ فوراً انسولین نامی ہارمونز کی پیداوار شروع کرتا ہے۔ یہ ہارمونز اس پیغام کے ساتھ کہ شکر کے ذخائر جلانے کا کام تیز کر دیا جائے دوران خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ہنگامی پیغام سیکنڈوں میں رگوں اور شریانوں کے ہزاروں میل لمبے جال سے گزر کر جسم کے کھرب ہا کھرب خلیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ خلیے اپنے میں موجود شکر تیزی سے جلانے لگتے ہیں اور جلد ہی خون میں شوگر کا تناسب درست ہو جاتا ہے۔ ہمیں کبھی اضافی توانائی کی ضرورت پیش آتی ہے تو جسم میں ایک نظام موجود ہے جس کے تحت اضافی توانائی سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فراہم کر دی جاتی ہے۔ اس طرح ہماری ہر جنبش آیت الٰہی ہے۔

۳۔ شعبہ ہدایت ورہنمائی

ڈی این اے (DNA) کائناتِ تن کا مدیر و مدبر: ڈی این اے اصل میں Deoxyribonucleic Acid کا مخفف ہے۔ DNA خلیے کے صدر مقام میں بیٹھ کر خلیہ کے کردار کا تعین کرتا ہے اور نظام جسم چلانے کے ضروری ہزاروں قوانین و کارکردگی کی ہدایات خلیے کو جاری کرتا ہے۔ DNA آیت مبارکہ:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔[1]

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

میں ثُمَّ هَدٰی ''پھر ہدایت دی'' کا بہترین مصداق ہے۔

DNA تخلیق انسان میں موجود اللہ تعالیٰ کے معجزات میں اہم ترین معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندہ موجودات میں اپنے وجود و بقاء کی ضروری ہدایت کا انتظام خود ان کے وجود میں ودیعت فرمایا ہے۔ چنانچہ DNA خلیات کو وہ تمام ہدایات جاری کرتا ہے جو زندہ اجسام کی بقاء و ارتقاء کے لیے ضروری ہیں۔ اس سے یہ نکتہ بھی نہایت واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے نظام میں خلق و تدبیر قابل تفریق نہیں ہے۔ جس نے خلق کیا ہے اسی نے تدبیری ہدایات اس مخلوق میں ودیعت فرمائی ہیں۔

ڈی این اے کیا ہے؟

ماں باپ کے کروموزوم (chromosome) مل کر جو خلیہ تشکیل دیتے ہیں اس کے مرکز میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے دو دھاگے ہیں۔ یہ دھاگے تین ارب مالیکیول (molecule) پر

[1] سورۃ طٰہٰ: ۵۰

مشتمل ہوتے ہیں۔ انہی تین ارب مالیکیول (سالموں) میں راز حیات مضمر ہے۔ سنہ ۲۰۰۰ء میں انکشاف ہوا تھا کہ حیات ان تین ارب سالموں کی منظم ترکیب سے وجود میں آتی ہے۔ اسی لیے ان دھاگوں کو تار حیات یا تار زندگی (خیط الحیاۃ) کہتے ہیں۔

انسان کے جسم کی ترکیب سوٹریلین خلیوں سے عمل میں آتی ہے۔ اگر ان تمام خلیات میں موجود ڈی این اے کے دھاگے نکال کر ایک لائن میں رکھے جائیں تو ان کی لمبائی زمین اور چاند کے درمیان فاصلے سے دس ہزار گنا زیادہ ہوگی۔

ان دھاگوں پر موجود مالیکیول یعنی ذرات میں راز حیات مضمر ہے۔ نہایت قابل توجہ ہے:

> خلیہ خود دس لاکھ گنا بڑا کرنے کے بعد قابل دید ہوتا ہے اور اس قدر چھوٹے وجود کے کئی شعبے ہیں۔ ان میں ایک شعبہ ڈی این اے ہے۔ ڈی این اے کے دو دھاگوں پر تین ارب ذرات (مالیکیول) ہیں۔ ان مالیکیول کے نہایت باریک ذرات کی منظم ترکیب میں راز حیات مضمر ہے۔

اس طرح اس کائنات کا سب سے پیچیدہ اور لایزال قدرت کا مظاہرہ ان ذرات میں پوشیدہ ہے۔

۴۔ شعبہ جینز (Genes)

ڈی این اے کے دہرے دھاگوں پر ہدایات کے کیمیکلز یعنی A.T.G.C میں سے کوئی تین مل کر ایک کوڈ بناتے ہیں اور بیسیوں ایسے کوڈ مل کر ایک جین (Genes) بناتے ہیں۔ ڈی این اے میں جینز کی تعداد ۳۰۰۰۰ سے ۴۰۰۰۰ ہزار تک ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عطاء الرحمن کہتے ہیں:

> جینز کو ایک چھوٹا سا خوردبینی ہار تصور کریں جس میں چار رنگوں کے تین بلین موتی پروئے ہوئے ہیں۔ دراصل یہ چار اقسام کے سالمے ہیں جن کو نیوکلک ایسیڈ (Neucleic acid) کہا جاتا ہے۔ ان کی ترکیب سے ہی ہماری شخصیت کی تمام خصوصیات کا تعین ہوتا ہے۔ ان سالموں کی ترتیب کو ''جینیاتی کوڈ'' کہتے ہیں۔

کہتے ہیں: یہ تمام جینز (Genes) ڈی این اے کے صرف تین فیصد حصّے میں پائے جاتے ہیں جب کہ باقی ماندہ حصوں کے ذمے ہے کہ وہ جینز (Genes) کو بتائیں کہ کس خلیے نے، کن حالات میں کیا کام، کس رفتار سے کرنا ہے یا سرے سے خاموش ہی رہنا ہے۔

انہی باقی حصوں میں وہ راز پوشیدہ ہے جس سے انسان کے رنگ، مزاج، لہجے، قد و قامت وغیرہ میں اختلاف آتا ہے۔ یعنی تین ارب سالموں میں سے صرف اعشاریہ ایک فیصد میں اختلاف سے لوگ مختلف نظر آتے ہیں۔

یہ جینز جو ڈی این اے کے صرف تین فیصد حصے میں موجود ہیں انہی میں انسان کی تمام خصلتیں موجود ہیں۔ آگے جا کر انسان نے بہادر بننا ہے یا بزدل، سخی بننا ہے یا بخیل، غصیلہ بننا ہے یا نرم مزاج، کس قسم کی ترجیحات کا مالک بننا ہے، یہ سب انسان کے جینز (Genes) میں پہلے سے ودیعت ہیں۔ البتہ جبر کی حد تک نہیں، ترجیح کی حد تک انسان میں موجود ہیں۔

بالمناسبۃ اس آیت کی تلاوت کرتے ہے:

قُلۡ كُلٌّ يَّعۡمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَنۡ هُوَ اَهۡدٰى سَبِيۡلًا ۔[1]

کہہ دیجیے: ہر شخص اپنے مزاج وطبیعت کے مطابق عمل کرتا ہے، پس تمہارا رب بہتر علم رکھتا ہے کہ کون بہترین راہ ہدایت پر ہے۔

تفسیر الکوثر میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

اگر لفظ شاکلۃ خلق اور طبیعت کے معنوں میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ بنے گا: مومن اور ظالم میں سے ہر شخص اپنے اپنے مزاج و طبیعت کے مطابق عمل بجا لاتا ہے۔ انسان کا کردار اس کا ضمیر فاش کرتا ہے اور ظاہری عمل باطنی ترجیحات پر دلالت کرتا ہے۔ اگر انسان اپنے مزاج و طبیعت میں عادل ہے تو اس سے عمل صالح نہایت آسانی سے صادر ہو جاتا ہے اور جس کا مزاج ظلم پسند ہے اس سے کار خیر سرزد ہونا آسان نہیں ہوتا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لو علم الناس کیف خلق اللہ تبارك و تعالی ھذا الخلق لم یلم احد احداً۔[2]

اگر لوگوں کو علم ہو جاتا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے لوگوں کو کس طرح خلق فرمایا ہے تو کوئی کسی کی ملامت نہ کرتا۔

---

[1] سورۃ الاسراء: ۸۴
[2] الکافی ۲: ۴۴

ممکن ہے اشارہ انسان کے DNA میں موجود جین (Gene) کی طرف ہو جس میں وہ بنیادی نقشہ ہے جس پر آگے چل کر انسان کی شخصیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔[1]

واضح رہے: ۹۹.۹ فیصد جینز (Genes) تمام انسانوں میں یکساں ہیں۔ اس لیے سب کے اعضاء و جوارح اور جسم کی مجموعی ساخت ایک جیسی ہے۔ چہرہ، سر، گردن، سینہ، ہاتھ، شکم، پاؤں وغیرہ سب کے یکساں ہیں۔ انسان کی جینز (Genes) میں صرف اعشاریہ ایک فیصد اختلاف آنے سے انسانوں کا آپس میں اختلاف آتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہر فرد پہچانا جاتا ہے۔ اگر کوئی اختلاف نہ ہوتا تو کسی کی شناخت نہ ہوتی اور نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کی ایک محیر العقول بات DNA میں موجود ہدایات ہیں۔ ہدایاتی کوڈ کو جینز کہتے ہیں۔ ان میں وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن سے خلیے کو آگے جا کر تعمیر بدن کرنی ہے۔ مقام تعجب یہ ہے کہ خود جینز کو ہدایات دینے والے اور ہیں جو بظاہر اسی ڈی این اے کے دھاگوں کے خالی مقامات میں ہیں۔

اس طرح جسم کی ہدایات کا سرچشمہ ڈی این اے کی ایسی جگہ پنہاں ہے جسے کل تک دانشمندان کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ہم اپنے خلیوں کی راز جوئی پر قادر نہیں ہیں۔ ہماری زندگی کا نقشہ ہمارے جینیٹک کوڈ (Genetic Code) میں موجود ہے۔ ''ڈی این اے جسم کی کتاب ہدایت'' ترجمہ و ترتیب محمد علی سید میں اس جگہ لکھا ہے:

> یہ ہدایات جنہیں کوڈ بھی کہتے ہیں اور جینز بھی، ناقابل بصارت مخلوق طے کرتی ہے کہ کتنی مدت میں کن کن بافتوں، اعضاء اور نظاموں کی تشکیل نے کس طرح ایک مکمل انسان میں تبدیل ہونا ہے۔
>
> تخلیق کے حیران کن اور عقل کو ششدر کر دینے والے ان تمام مرحلوں کی تکمیل کے لیے خام مال کہاں سے، کب، کتنا اور کس طرح آئے گا اور کس طرح کہاں استعمال ہو گا۔ مختلف اعضاء کس طرح بنیں گے، کب ان کا بننا مکمل ہو جائے گا، ان کی تنصیب کہاں ہو گی۔
>
> اعضاء کا یہ مجموعہ کس طرح ایک دوسرے سے مل کر کام کرنا شروع کرے گا۔ یہ اعضاء

[1] الکوثر فی تفسیر القرآن ۴: ۵۶۳

کب تک کام کریں گے، کیا کیا سہولتیں فراہم کریں گے۔
زمین و آسمان سے زندگی کے مختلف اجزاء حاصل کر کے پروان چڑھنے والا یہ حیران کن جسم کب اور کتنی مدت میں ہڈیوں اور گوشت کے قابل تدفین ڈھیر میں تبدیل ہو کر مٹی میں مل جائے گا۔ اس کے مر جانے کا سبب ہارٹ اٹیک ہو گا یا شریانوں کے سخت ہو جانے کے سبب اس کی موت واقع ہو گی۔ شوگر کا مرض اسے دیمک کی طرح چاٹ جائے گا یا کینسر کی بیماری اسے موت کے گھاٹ اتارے گی یا پھر غم کی زیادتی کے سبب اس کے چراغ کا سارا تیل رفتہ رفتہ ختم ہوجائے گا اور ایک دن اچانک اس کا چراغ بجھنے کا سبب بنے گا۔
یہ ساری تفصیلات، ہدایات، احکامات خون کے سرخ خلیوں کے علاوہ جسم کے سو (۱۰۰) ٹریلین خلیوں میں سے ہر ایک میں بھی موجود ہوتی ہیں۔
مختصر تاریخ موجودات میں لکھا ہے:
آپ کے خلیے دس ہزار ٹریلین شہریوں پر مشتمل ایک مملکت کی مانند ہیں جو اپنے اپنے طور پر پوری تندہی سے آپ کی بہبود میں جتے ہوئے ہیں۔ کوئی ایسا کام نہیں جو وہ آپ کے لیے نہیں کرتے۔ وہ آپ کو خوشی بہم پہنچاتے ہیں اور آپ کے دماغ میں خیالات جنم دیتے ہیں۔ وہ آپ کو کھڑا کرتے، انگڑائی دلاتے اور چلاتے پھراتے ہیں۔ جب آپ غذا کھاتے ہیں تو اس سے ضروری اجزاء نکالتے، توانائی تقسیم کرتے اور فضلے خارج کرتے ہیں....
یہی خلیے آپ کو بھوک کا احساس دلاتے ہیں اور کھانے کے بعد جو طمانیت آپ کو محسوس ہوتی ہے وہ بھی خلیوں کی بدولت ہے تا کہ اسی احساس کے تحت آپ دوبارہ کھانے کی طرف راغب ہوں۔ وہی آپ کے بال اُگاتے ہیں۔ آپ کے کانوں میں ویکس بناتے اور آپ کا دماغ جگائے رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے سارے کام بجا لاتے ہیں۔ جب کبھی آپ کو خطرہ ہو دوڑ کر آپ کی مدد کو آتے ہیں۔ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کروڑوں کی تعداد میں آپ پر قربان ہو جائیں گے۔ روزانہ وہ ایسا کر رہے ہیں اور شاید ایک مرتبہ بھی آپ نے ان کا شکریہ ادا نہیں کیا۔

سوال یہ ہے:

ا۔ بے شعور مادے میں یہ شعور!؟

۲۔ بے مقصد اتفاقیہ کا یہ عظیم مقصد!؟

۳۔ بے ارادہ نیچر کا یہ حکیمانہ ارادہ!؟

کیسے ممکن ہوا؟

شکریہ اس خالق کا کرنا چاہیے کہ جس نے ہماری زندگی کو اس قدر سہولیات فراہم فرمائی ہیں جن کا ہمیں احساس تک نہیں۔ ہماری اپنی غلطی سے جسم کے کسی حصے پر زخم آتا ہے تو یہ خدمت گزار خلیے اسے مندمل کرنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں اور ہم بے احتیاطی سے ضرر رساں جراثیم جسم میں آنے دیتے ہیں تو ہمیں بتائے بغیر از خود ان مضرات سے ہمارا دفاع کرتے ہیں اور ہمیں خبر تک نہیں ہے۔

۵۔شعبہ پیغام رسان۔آر این اے

خلیے کے مرکز میں DNA کے ساتھ اس کا پیغام بر R N A (nucleic acids) ہوتا ہے۔ یہ Ribonucleic acid کا مخفف ہے۔ اس کے ذرات (مالیکیول) خاصے چھوٹے ہوتے ہیں اور خلیے کے مرکز کے علاوہ خلیے کے باہر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے RNA کا مرکز سے باہر نکلنا ممکن ہوتا ہے اور اس کا فرض منصبی بھی مرکز سے پیغام لے کر باہر نکلنا ہے۔

چنانچہ RNA مرکز سے اہم پیغام لے کر نکلتا ہے اور اپنے ایک قسم کے RNA کے پاس جا کر اسے وہ راز بتاتا ہے جو اس نے انجام دینا ہے۔ چنانچہ یہاں سے ایک تیسری قسم کا RNA جسے قاصد کہا جاتا ہے، متعلقہ عناصر کو آواز دیتا ہے۔ وہ سب جمع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ سب کو اپنے کنٹرول میں لیتا ہے اور انہیں ہدایات جاری کرتا ہے جیسا کہ یہ ایک ماہر فن اور سب سے بڑا عاقل و دانا ہو۔ ہدایات یہ جاری کرتا ہے کہ وہ پروٹین یا ہارمونز تیار کریں۔

ا۔ کوئی بتا سکتا ہے اسے یہ اہم، دقیق اور پیچیدہ رموز کس نے سکھائے؟

۲۔ کیا کسی بے شعور نے یہ اہم ترین شعور دیا؟ بے شعور تو کسی کو کچھ دینے کا شعور نہیں رکھتا۔ اتنی بڑی دلیل سامنے آنے کے باوجود انکار!!

''ڈی این اے جسم کی کتاب ہدایت'' میں آیا ہے:

ڈی این اے خلیے میں پایا جاتا ہے۔ یہ مرکزہ ایک جھلی میں بند ہوتا ہے۔ اس جھلی

میں ننھے منے سوراخ ہوتے ہیں۔ یہ سوراخ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ڈی این اے ان سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ڈی این اے کے دھاگے کسی زپ کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں لیکن جب ڈی این اے اپنی کاپی بنانے لگتا ہے تو یہ زپ کھل جاتی ہے اور ڈی این اے کے دھاگے الگ الگ ایک دوسرے کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس مرحلے کے بعد ڈی این اے اپنے حصے کی کاپی بنانے لگتا ہے۔

پیغام بر آر این اے۔

ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ ڈی این اے میں موجود کوڈز، حیاتیاتی یا جینیاتی معلومات ان چار حروف G.U.A.C سے لکھی ہوتی ہیں۔ A یعنی ایڈی نائن (adenine)، C یعنی سائٹوسین (cytosine) اور G یعنی گوانین (guanine) اور U یعنی یورسل (uracil) ۔ ڈی این اے جب اپنے چھوٹے سے حصے کی کاپی بنانی شروع کرتا ہے تو وہ میسنجر (پیغام بر) آر این اے کو بتاتا ہے۔ اس پیغام بر یعنی آر این اے میں ڈی این اے کے برعکس صرف ایک دھاگا یا زپ کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اس میں A ایڈی نین (adenine) کے ساتھ ایک اور کیمیائی حرف u یعنی یورسل (uracil) لگتا ہے۔

اگرچہ آر این اے بننے دوران اور بعد میں اس میں کئی تبدیلیاں آتی ہیں جن کے بعد آر این اے کا دھاگا مکمل ہو کر ڈی این اے کا پیغام ''جنیٹک انفارمیشن'' یعنی تخلیق کے لیے ضروری ہدایات لے کر خلیے کے مرکز کی جھلی کے ننھے منے سوراخوں سے باہر نکل آتا ہے۔

ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ آر این اے جھلی سے باہر آ کر پروٹین یا ہارمون بنانے کا آڈر دیتا ہے۔ چنانچہ متعلقہ مشین رائبوسوم (Ribosome)، جسے پروٹین بنانے کی مشین کہا جاتا ہے، پروٹین کی لڑیاں اور بافتے بناتی ہے۔ ان سے اعضاء اور اعضاء سے انسان بنتے ہیں۔

6۔ شعبہ حفاظتی حصار

خلیے کو ایک حفاظتی حصار میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس حصار کی ذمہ داری ہے:

ا۔ خلیے کے تمام اجزاء سمیٹ کر محفوظ رکھنا۔

۲۔ حفاظتی جھلی کسی چیز کو خلیے میں جانے اور کسی چیز کو خلیے سے باہر نکلنے کی جازت دینے کی ذمے دار ہے۔ جیسے فضلے اور انسان کے جسم میں موجود اربوں خلیات میں سے کس خلیے کو اس خلیے کے قریب آنے کی اجازت نہیں دینا ہے۔ جسم میں خلیات کے مختلف گروپس ہوتے ہیں۔ اگر آنے والے خلیے کا تعلق اسی گروپ سے ہو تو یہ جھلی اسے اندر آنے کی اجازت دیتی ہے اور یہ آپس میں مل کر مطلوبہ چیز تخلیق کرتے ہیں۔ اگر اس گروپ سے اس کا تعلق نہیں ہے تو اسے دور بھگا دیتی ہے۔ اگر حفاظتی حصار (جھلی) یہ کام نہ کرے تو تخلیقی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

کس نے اس جھلی کو سمجھایا کہ کس خلیے میں کون سا راز پوشیدہ ہے۔سبحان الخلاق العلیم۔

۳۔ اس حفاظتی جھلی کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ خلیے کے اندرونی حالات پر نظر رکھے کہ خلیے میں موجود اشیاء میں کیا تناسب برقرار رکھنا ہے۔

الحادی نظریات کے حامل بتائیں: کس نے اس جھلی کو مطلوبہ تناسب کی کسوٹی سمجھائی ہے؟

۷۔ شعبہ مواصلاتی نظام

ہمارے جسم میں اربوں سیلز آپس میں مربوط و منظم اور متعدد شعبہ ہائے زندگی میں منقسم ہوتے ہیں۔ ہر شعبے کے خلیات معین ہیں۔ جو خلیات جس شعبے کے لیے تعینات ہیں اسی سے متعلق امور انجام دیتے ہیں دوسرے شعبوں میں مداخلت نہیں کرتے۔ باہم مربوط ہوتے ہیں اور منظم بھی۔ اس تنظیم کی ذمہ داری ہے کہ وہ خلیوں کی فعالیت کی نگرانی کرے۔

چنانچہ اس تنظیم کو قائم رکھنے کے لیے پیغام رسان ہارمون تیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم کے ہارمونز تمام خلیوں کی فعالیت چیک کرتے ہیں۔ اسی طرح انسولین بنانے والا ہارمونز جسم میں شوگر تمام خلیوں میں پہنچانے کی ذمے داری انجام دیتے ہیں اور ایک قسم کے ہارمونز خون میں نمک اور پانی کا تناسب اور توازن برقرار رکھتے ہیں۔

اس طرح سینکڑوں ہارمونز خلیوں کے درمیان رابطہ کرتے ہیں اور یہ نظام نہایت دقیق اور معیاری انداز میں قائم ہے۔ ان ہارمونز کے بغیر جسم میں منظم کارکردگی ممکن نہیں۔ یہ ہارمونز نہ ہوتے تو جسم میں نہایت بدنظمی اور دگرگونی ہو جاتی۔

الحادی نظریہ رکھنے والوں سے سوال ہے کہ ان خلیوں کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے خلیوں کو کیا چاہیے اور یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ ضروری

تناسب قائم رکھنے کے لیے کس قسم کے ہارمونز تیار کرنا ہیں؟
بے علم نیچر میں یہ علم؟! کیا کہنے!! بے شعور مادے کا یہ شعور! کیا بات ہے!!
ان جیسے دیگر بے شمار سوالات کا ایک ہی معقول جواب ہے کہ ان نہایت چھوٹی خلائق کو شعور دینے والی ذات اللہ تعالیٰ ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز پر اس کی حکومت و اقتدار نافذ ہے۔

خلیے کے تخلیقی معجزات

اب ہم انسان کی تخلیق میں خلیات (Cells) کے نہایت محیر العقول معجزات کا مطالعہ کرتے ہیں۔
اب تک انسان نے خلیوں کے جن حیرت انگیز حقائق تک رسائی حاصل کی ہے ان کی روشنی میں ہمارے سامنے اللہ کی واضح ترین اور ناقابل تردید نشانیاں سامنے آتی ہیں۔
انسانی جسم کی تخلیق نطفہ پدر اور تخم مادر کے اشتراک سے ہوتی ہے۔ یعنی انسانی جسم کی تخلیق کی بنیادی اینٹ وہ خلیہ ہے جسے ماں اور باپ دونوں مل کر تشکیل دیتے ہیں۔ چنانچہ خلیہ کی دو قسمیں ہیں: ایک جسمانی سیل اور دوسرا جنسی سیل۔ جسمانی سیل ایک مستقل سیل ہے جس کے مرکزے میں ۴۶ کروموزومز (Chromosome) ہوتے ہیں جب کہ جنسی خلیہ مستقل نہیں بلکہ نصف خلیہ ہوتا ہے۔ اس کا مرکزہ صرف ۲۳ کروموزومز پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح ماں اور باپ کا جنسی خلیہ یعنی نطفہ پدر اور تخم مادر میں سے ہر ایک ۲۳ کروموزومز پر مشتمل ہے اور جنسی آمیزش کے ذریعے ۲۳ کروموزومز باپ اور ۲۳ کروموزومز ماں سے فراہم ہوتے ہیں۔اس طرح ۲۳+ ۲۳=۴۶ کروموزومز پر مشتمل ایک مکمل خلیہ تشکیل پاتا ہے۔
ارشاد الٰہی ہے:

فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ۔[1]

پس انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔
آیئے! نظر کرتے ہیں کہ ہم کس چیز سے پیدا ہوئے ہیں:
ارشاد الٰہی ہے:

خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ۔[2]

---

[1] سورۃالطارق:۵
[2] سورۃالطارق:۶

وہ (انسان) اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔

نطفہ پدر کی ایک بوند میں چار سو ملین جرثومے (Sperm) ہوتے ہیں۔ جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ مرد کے پانی جس میں جرثومے ہوتے ہیں، سے حمل ٹھہرنے کے لیے اس میں حرکت (اچھلنا) ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ عورت کے جس پانی میں تخم موجود ہے اس پانی کا بھی اچھلتے ہوئے حرکت کرنا حمل کے لیے ضروری ہے۔

مرد کا پانی نطفے (جرثوموں) کے علاوہ ایسے عناصر پر بھی مشتمل ہوتا ہے جو حمل ٹھہرانے میں معاون ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ایسا مادہ سامنے آتا ہے جو رحم میں کھچاؤ پیدا کرتا ہے جس سے جرثومہ پدر کو حمل ٹھہرنے کی جگہ پر پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

اسی طرح تخم مادر کے ساتھ بھی ایسے عناصر فعال ہوتے ہیں جو حمل ٹھہرانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

قابل توجہ ہے کہ رحم میں کچھ انزائم مترشح ہوتے ہیں جو جرثومہ پدر میں مانع حمل پروٹین ہٹا دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ انزائم ان خلیوں کو بھی ہٹا دیتے ہیں جو تخم مادر کے گرد ہیں اور اس پردے کو بھی ہٹا دیتے ہیں جو جرثومہ پدر اور تخم مادر کے جفت ہونے میں حائل ہے۔

الحادی بتائیں! کیا انزائم بے شعوری میں یہ کام کرتے ہیں؟

چنانچہ نطفہ پدر میں موجود لاتعداد جرثوموں میں سے کوئی پانچ سو جرثومے اس جگہ پہنچ پاتے ہیں جہاں تخم مادر انتظار میں ہے۔ ان پانچ سو جرثوموں میں سے صرف ایک جرثومہ تخم مادر کے ساتھ جفت ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ کامیاب ہونے والا جرثومہ جب تخم مادر سے جفت ہونے کی غرض سے اس کے پاس پہنچتا ہے تو تخم ایک خاص انداز میں اس کا استقبال کرتا ہے۔ اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے اور جرثومہ پدر تخم مادر میں داخل ہو جاتا ہے۔ قرآنی تعبیر کے مطابق نطفة امشاج مخلوط نطفہ تشکیل پاتا ہے۔

قابل توجہ ہے کہ انسانی جسم بیرونی چیز کو مسترد کر دیا کرتا ہے لیکن بیرون سے آنے والے نطفہ کو تخم مادر نہ صرف خوش آمدید کہتا ہے بلکہ اس کے لیے سامان زیست فراہم کرتا ہے۔

عصمت نسواں

عصمت نسواں کا ایک حیرت انگیز مظاہرہ یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ جب ایک جرثومہ تخم کے ساتھ جفت ہو جاتا ہے تو باقی جرثوموں کے لیے تخم میں جانا ممنوع اور ناممکن ہو جاتا ہے اور تخم پر ایک پردہ چھا جاتا ہے جس کی وجہ سے کوئی اور جرثومہ تخم کے نزدیک نہیں آ سکتا۔ یعنی تخم کے رشتہ ازدواج میں

منسلک ہونے کے بعد باقی نامحرم جرثوموں کو اس کی طرف آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چنانچہ دیگر تمام جرثومے کف افسوس ملتے ہوئے مرجاتے ہیں۔ حجاب کے مخالف خواتین و حضرات کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔

جنس کا تعین

نطفہ پدر میں x اور y دونوں ہوتے ہیں جبکہ تخم مادر میں صرف x ہوتا ہے۔ اگر باپ کا y ماں کے x کے ساتھ جفت ہو جائے تو یہ مولود بچہ ہوگا اور اگر باپ کا x ماں کے x کے ساتھ جفت ہو جائے تو مولود بچی ہوگی۔ لہذا جنس کا تعین نطفہ پدر میں ہے۔ تخم مادر میں نہیں۔

واضح رہے چار سو ملین جرثوموں میں سے ہر ایک کی خاصیت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کس خاصیت کا حامل جرثومہ تخم مادر سے جفت ہونے والا ہے۔ پھر یہ بھی صرف اللہ جانتا ہے کہ یہ جرثومہ x ہے یا y جس سے آنے والے بچے کی جنسیت کا تعین ہونا ہے۔ لہٰذا وَيَعۡلَمُ مَا فِي ٱلۡأَرۡحَامِ ...۔[1] ''اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے'' پر یہ سوال نہیں آتا کہ انسان کو بھی علم ہونے لگا ہے کہ رحم میں کیا ہے کیونکہ انسان کو تو آخری مرحلوں میں اس کا علم ہوتا ہے۔ ابتدائی مراحل کا علم صرف اللہ تعالیٰ سے مختص ہے۔

سوئے منزل

جرثومہ پدر اور تخم مادر کے جفت ہونے کے بعد ایک خلیہ مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ خلیہ رحم مادر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے کیونکہ ان دونوں کا جفت رحم سے پرے ایک جگہ ہوتا ہے۔

اب یہ اپنے حجلہ عروسی میں منتقل ہوجاتا ہے اور حجلہ عروسی میں مہمان کی آمد سے پہلے اس کے لیے قالین بچھا ہوتا ہے۔ یہ خلیہ اس قالین پر بیٹھ جاتا ہے اور قدرت کا ایک عظیم معجزہ سامنے آتا ہے کہ یہ خلیہ رحم کی جس جگہ مستقر ہوتا ہےاس جگہ کو چھیل دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس پراسرار دانے کی رحم کی زمین پر کاشت کی جاتی ہے اور یہ دانہ (خلیہ) رحم مادر سے غذا چوسنا شروع کرتا ہے۔

ضروری نہیں آیت شریفہ کا اشارہ اسی طرف ہو لیکن قابل توجہ ہے۔ فرمایا:

نِسَآؤُكُمۡ حَرۡثٌ لَّكُمۡ فَأۡتُواْ حَرۡثَكُمۡ أَنَّىٰ شِئۡتُمۡ ...۔[2]

[1] سورۃ لقمان: ۳۴
[2] سورۃ البقرۃ: ۲۲۳

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جا سکتے ہو....
چنانچہ یہ خلیہ رحم کی زمین پر کاشت ہونے کے بعد اسی طرح رحم سے غذا چوستا ہے جس طرح دانے کی جڑیں زمین سے اپنی مطلوبہ غذا چوستی ہیں۔

عالم اصغر کی تخلیق

اب اس کائنات میں اللہ کا عظیم معجزہ تخلیق ہونے کو ہے اور یہ چھوٹا سا وجود (خلیہ) اپنی کرشمہ سازی دکھاتا ہے۔
جب تخلیق کا مرحلہ آتا ہے تو خلیے میں موجود ہدایت نامہ اور راز حیات ڈی این اے اپنے دونوں لچھوں میں بٹ جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ڈی این کے دونوں دھاگے اپنے اپنے سینے چاک کر کے دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں اور تقریباً ۲۰ سے ۸۰ منٹ میں اپنی کاپی بناتے ہیں۔
آپ کو معلوم ہے کہ ڈی این کے دونوں دھاگے تین ارب مالیکیول (سالموں) پر مشتمل ہیں۔ اس مختصر وقت میں تین ارب سالموں کی کاپی بن جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تین ارب حروف پر مشتمل ایک کتاب کی چند منٹوں میں کاپی بن جاتی ہے۔ یہ کتاب تین ارب حروف، ایک ملین صفحات اور ایک ہزار جلدوں پر مشتمل ہے جن میں انتہائی اہمیت کا حامل سینہ کائنات میں پوشیدہ راز یعنی راز حیات بھی شامل ہے۔ چنانچہ یہ خلیہ تقسیم کے ذریعے اپنی تعداد میں اضافہ کرتا ہے۔ ایک سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے سولہ، اسی طرح بعض سائنسدانوں کے نزدیک ۳۲ اور دیگر بعض کے نزدیک ۱۲۵ سیلز کی تعداد تک تقسیم ہوتا ہے۔ تقسیم سے پہلے ہر ایک سیل (cell) میں ایک مکمل انسان بنانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اسے سٹیم سیل کہتے ہیں۔ ۱۲۵ کی تعداد کو پہنچنے کے بعد تقسیم کار کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی انسانی تخلیق کی ذمہ داریاں تقسیم ہو جاتی ہیں۔

"ڈی این اے جسم کی کتاب ہدایت" میں ایک اہم بات کا ذکر ہے:

> ۱۹۷۰ء میں ماہرین نے دیکھا کہ DNA دوسرے خلیے میں اپنی کاپی منتقل کر رہا ہے۔ اچانک ایک خاص مادہ منتقلی کے اس عمل میں مداخلت کرتا نظر آتا ہے۔ انٹرون (Intron) نامی اس مادے کو ابتداء میں ایک اتفاقی واقعہ سمجھا گیا۔ بعد کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ انٹرون (Intron) ڈی این اے کے چیک اینڈ بیلنس کا حصہ ہے اور اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ جینز (Genes) (وراثتی خصوصیات)

کے ایک خلیے سے دوسرے خلیے میں منتقلی کے عمل میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو اور جینز بالکل درست انداز میں دوسرے خلیے میں منتقل ہو جائیں۔

نہایت قابل توجہ ہے کہ تقسیم کے بعد خلیات کو صرف اپنے شعبے میں فعالیت کرنے کی صلاحیت دی جاتی ہے۔ باقی صلاحیتیں بلاک کر دی جاتی ہیں۔

تقسیم کے وقت ہر خلیے کے شعبے کا تعین کیا جاتا ہے۔ خلیوں میں تخلیق انسان کی ذمہ داریوں کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کی عظیم ترین نشانی اور حیرت انگیز معجزہ ہے۔

چنانچہ ان خلیوں میں سے کچھ کے ذمے جگر، کچھ کے ذمے دماغ، کچھ کے ذمے اعصاب اور کچھ کے ذمے ہڈی، آنکھ، ناک، کان وغیرہ بنانے کی ذمہ داری عائد کی جاتی ہے۔

یہ ذمے داریاں کون عائد کرتا ہے؟ کون ان خلیوں کو سمجھاتا ہے کہ انہوں نے جگر یا دماغ بنانا ہے۔ ان خلیوں کو کہاں سے معلوم ہوا جگر کیا ہے اور دماغ کیا ہے۔ جگر و دماغ کے فرائض کیا ہیں۔ کس نے ان خلیوں کو پڑھایا کہ جگر کے نام سے ایک ایسا شعبہ بنانا ہے جس نے آیندہ جسم کی پانچ سو سے زیادہ مختلف خدمات انجام دینی ہیں!؟ ملحدوں کی عقلوں پر پردہ پڑا ہوا نہیں ہے تو وہ بتائیں کہ کاموں کی تقسیم سے پہلے ان خلیوں کو جگر اور دماغ کا کیسے علم ہوا اور تقسیم کے بعد خلیوں نے کیسے سمجھا کہ جگر یا دماغ کیا ہوتا ہے؟ اس قدر پیچیدہ اور عظیم شعبے دماغ اور جگر کی کسے ضرورت ہے؟ کیا اندھی نیچر نے سمجھایا؟! وہ تو خود سمجھ نہیں رکھتی، آگے کیا سمجھائے گی۔

اسی طرح ہر خلیہ اپنے شعبے میں انتہائی مہارت کے ساتھ پیچیدہ ترین عضو اسی طرح بناتا ہے جیسے اسے ہدایت ملی ہے۔

مثلاً ان خلیوں کو ہدایت ملی ہے کہ اس بچے کی شکل و شباہت اس کے ماموں پر بنانی ہے تو اسے علم ہے کہ ماموں کی آنکھیں کتنی بڑی ہیں، ناک کتنی اونچی ہے۔ منہ کتنا بڑا ہے، گردن کتنی اونچی اور سینہ کتنا چوڑا ہے۔

کیا معلم کے بغیر یہ حیرت انگیز تعلیم، تعلیم کے بغیر یہ حیرت انگیز

مہارت اور مہارت کے بغیر یہ حیرت انگیز کارنامہ اتفاقاً از خود وجود میں آسکتا ہے!؟

کیا وہ یہ جواب دیں گے کہ یہ سب طبیعت (نیچر) کے تقاضے ہیں؟ ہم کہیں گے نیچر میں حیرت انگیز تنظیم مُنظّم کے بغیر، یہ حیرت انگیز مقصد، قصد کے بغیر، یہ عظیم مراد ارادے کے بغیر، یہ عظیم صنعت، صانع کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ بےشعور نیچر کے شعور میں کیسے آیا کہ پانچ سو قسم کی مختلف ذمہ داریاں انجام دینے والی ایک چیز بنانی ہے جس کی جسم کو ضرورت ہے۔ جسے ہم جگر کہتے ہیں۔

اگر انسان کی تخلیق کے موقع پر ایک کامل انسان بنانے کا خلیوں کو قدرت نے پابند نہ کیا ہوتا تو نیچر کا اپنا کوئی دماغ نہیں، اس نے دماغ کیسے بنایا؟ نیچر میں سوچنے کی کوئی صلاحیت نہیں، اس نے سوچنے کی صلاحیت سے بھرپور دماغ کیسے بنایا؟ نیچر کی اپنی کوئی آنکھ نہیں، اس نے کوئی آنکھ دیکھی بھی نہیں، اس نے آنکھ کیسے بنائی؟ اور انسان کے لیے آنکھ کی ضرورت کا اس بےشعور نیچر میں شعور کیسے آیا؟

بےغرض بےشعور نیچر نے شعور کے بغیر دنیا کو کیسے شعور سے پُر کیا؟

اس بےغرض اندھی نیچر کی حیرت انگیز غرض مندی کا کیا کہنا!!

اس بےمغز نیچر کی پُرمغز کرشمہ سازی کا کیا کہنا!!

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا انسانی تخلیق کے بارے میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۠﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۭ﴿۱۴﴾[1]

[1] سورة المومنون: ۱۲ تا ۱۴

اور بتحقیق ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے بنایا۔ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا دیا۔ پھر ہم نے نطفے کو لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے کو بوٹی کی شکل دی پھر بوٹی سے ہڈیاں بنا دیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا، پس بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین خالق ہے۔

قَرَارٍ مَّكِيْنٍ: محفوظ جگہ۔ اس محفوظ جگہ پر جنین کی حفاظت کے تمام وسائل فراہم ہیں۔

مَّكِيْنٍ: قدرت مند۔ رحم مادر کا محل وقوع بہت مضبوط ہے۔ رحم مادر جسم کے عین مرکز میں مضبوط ہڈیوں اور عضلات کے حصار میں ہے۔

فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا: پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ مراحل تخلیق میں فرمایا: نطفہ کو لوتھڑا، اسے بوٹی، بوٹی کو ہڈی بنا دیا۔ بعد میں یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے ہڈی کو گوشت بنایا بلکہ فرمایا: ہم نے ہڈی پر گوشت چڑھایا۔

انسان کو انیسویں صدی میں علم ہوا اور قرآن نے چودہ سو سال پہلے بتایا دیا کہ گوشت ہڈی کا لباس ہے، ہڈی سے گوشت نہیں بنتا۔

خلیے کی قدرت شناخت

خلیات میں ایسی سوجھ بوجھ اور ایسا شعور ہے جو خود ہم میں نہیں ہے۔ چنانچہ اگر مختلف معادن کے غبار ہمارے سامنے آئیں تو ہم ان میں موجود معدنیات پہچان نہیں سکتے جب کہ ہمارے جسم میں موجود ایک سو ارب خلیوں میں یہ شعور وادراک ہے کہ وہ ان معدنیات کو نہایت آسانی سے کسی قسم کی غلطی کیے بغیر پہچان لیں۔

ہر خلیہ واضح طور پر سمجھتا ہے کہ جسم کو کتنی مقدار میں لوہے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کتنی مقدار میں فاسفورس، سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم اور دیگر مواد کی ضرورت ہے۔ ان تمام معدنیات کو ہر خلیہ پہچانتا ہے۔ جسم کی ضرورت کی مقدار کے مطابق جمع کرتا ہے اور ضرورت سے زیادہ سٹور کرتا ہے تا کہ بوقت ضرورت کام آئے اور غیر ضروری کو اپنے سے باہر پھینک دیتا ہے۔

سچ فرمایا قادر مطلق نے:

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔[1]

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

---

[1] سورة طٰہٰ: ۵۰

خلیے کی اقسام

قابل توجہ ہے کہ ہمارے جسم میں اربوں خلیے ہیں۔ ان سب کی اصل ایک ہے اور اس کے تقسیم ہونے کے ذریعے صرف ایک خلیے سے یہ تعداد بڑھ گئی۔ ایک اصل سے نکلنے والے خلیات ایک دوسرے سے نہایت مختلف ہیں۔ اعصاب، خون، آنکھ، کان، آنتوں، دماغ، ہڈیوں اور دیگر کے خلیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ہر ایک کی ڈیوٹی بھی مختلف ہے۔ اس طرح کہ شروع میں ایک خلیے کے تقسیم ہونے کے ذریعے جب خلیوں کی تعداد مقررہ حد تک پہنچ جاتی ہے تو ان میں تقسیم کار ہوتی ہے اور ذمہ داریوں کی تقسیم کے بعد ہر خلیہ اپنے شعبے کے تقاضوں کے مطابق ڈھل جاتا اور متعلقہ ڈیوٹی انجام دیتا ہے۔

ہارمونز (Hormones) اور جنس

انسانی جسم کے خلیوں اور ہارمونز میں ارتباط ہے۔ ایک دوسرے کے پیغامات کا تبادلہ ہوتا ہے اور یہ پیغامات کا مضمون بخوبی سمجھتے ہیں کہ اس ذمے داری کو کب اور کہاں انجام دینا ہے۔

FSH (Follicle Stimulating Hormone) ہارمون عورتوں میں تخم پیدا کرتے ہیں جو ٹیسٹوسیٹرون (testosteronne) ہارمون اور ایسٹروجن (estrogen) ہارمون پیدا کرتے ہیں۔ ٹیسٹوسیٹرون (testosteronne) ہارمون مردوں میں مرد کی جسمانی استعداد کے مطابق کام کرتے ہین۔ جیسے آواز موٹی کرنا، داڑھی مونچھیں بنانا اور عورتوں میں (estrogen) ہارمون آواز باریک کرنے کا کام کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان ہارمون کو علم ہے کہ عورتوں کے جسم میں کیا ڈیوٹی انجام دینی ہے اور مردوں کے جسم میں کیا کارکردگی دکھانی ہے۔

کیا ممکن اور معقول ہے کہ ان ہارمونز کو کوئی شعور نہ ہو اور اتفاقاً مردوں اور عورتوں میں ہر ایک کے لیے موزوں، مناسب اور ضرورت کے مطابق کام کریں اور کسی جگہ کوئی غلطی نہ کریں؟

غلطی کا ارتکاب تو الحادی نظریہ رکھنے والے بدنصیب لوگ کر رہے ہیں۔

تنفّس

زندہ سیلز الحادی نظریہ رکھنے والوں کے نزدیک اتفاقاً از خود وجود میں آئے ہیں۔ انہیں کسی نے قصداً نہیں بنایا۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ ان کے وجود میں آنے کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اگر مقصد ہے تو قصد بھی ہے۔ اگر قصد ہے تو اتفاقاً نہیں، قصداً ہے۔ آگے ہم خلیات کی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ان کے وجود کا

کوئی مقصد ہے یا نہیں۔

تنفّسی عمل کی انجام دہی پر مامور سیلز ایک سو باریک بالوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ بال کشتی کے چپو کی طرح سیلز کو آگے بڑھانے کا کام دیتے ہیں۔ اگر ہم ان بالوں کو طولاً دیکھیں یہ نو چھوٹی چھوٹی سلاخوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے دو حلقوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک حلقہ تیرہ باریک دھاگوں اور دوسرا حلقہ دس باریک دھاگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

یہ سلاخیں ڈائنین پروٹین (Dynein protein) سے بنتی ہیں۔ اس کے بھی دو جزء ہیں۔ ''ڈائنین پروٹین'' سیلز کو حرکت دیتے ہیں اور یہ تنفس کا مکمل نظام ہے جو ہر انسان میں موجود ہے۔

سانس لینے کا عمل ہمارے ہاتھ میں نہیں دیا گیا جیسا کہ کھانا پینا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ کام ہمارے ہاتھ میں دیا ہوتا تو ہم آسانی سے مر جاتے۔ بھول جانے، سو جانے اور کسی مہم میں انہاک کی وجہ سے سانس لینا رک جاتا اور صرف پانچ منٹ میں ہماری جان، جاں آفرین کے حوالے ہو جاتی۔

تنفس کا مرکز دماغ میں چنے کے برابر ایک معین جگہ پر ہے۔ اس مرکز کے اعصابی سیلز تین گروہوں پر مشتمل ہوتے ہیں:

پہلا گروہ: ان خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے جو ہوا جذب کرنے پر مامور ہیں تا کہ سانس لینے کا عمل ممکن ہو۔

دوسرا گروہ: اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ سانس لینے کے عمل میں سرعت پیدا کرے اور سانس آگے بڑھ جائے۔ واضح رہے کہ جب یہ گروہ اپنا کام شروع کرتا ہے تو پہلے گروہ کو جو ہوا جذب کرنے پر مامور ہے کام سے روک دیا جاتا ہے تا کہ سانس کی نالی میں ہوا جاری کرنے کی تیاری ہو سکے۔

تیسرا گروہ: اس گروہ کے خلیے غیر فعال ہوتے ہیں اور سانس لینے کے عمل میں کوئی مداخلت نہیں کرتے لیکن جب سانس لینے کے لیے معمول سے زیادہ ہوا کی ضرورت پیش آئے تو یہ خلیے آگے آتے ہیں اور شکم کے اعصاب کو اشارے بھیجتے ہیں کہ وہ بھی سانس لینے کے عمل میں شریک ہو جائیں۔

ہمیں زندہ سلامت رکھنے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ تنفس کا عمل منظم رکھنے کے لیے تنفس کے مرکز یعنی دماغ میں بعض خلیے تنفس کی کیمیکلی نگرانی کرتے ہیں چونکہ سانس لینے کے دوران آکسیجن (oxygen O_2) اور carbon dioxide CO_2 کا خون میں ایک معین تناسب سے ہونا ضروری ہے۔

اس مطلوبہ تناسب میں رد و بدل ہونے سے بچانے کے لیے کڑی نگرانی ہوتی ہے۔

یہاں پر موجود خونی خلیے دماغ کو معلومات فراہم کرتے ہیں کہ مجرائے خون جیسی گردن کی رگوں میں خون میں اوکسیجن کس مقدار میں شامل ہو رہی ہے۔ اس حیرت انگیز طریقے سے فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں دماغ اوکسیجن میں ضروری تناسب قائم کرتا ہے۔

سوال: کیا اس حیرت انگیز شعور کے مالک خلیے اپنی ذمہ داری پر سو فیصد اتفاقاً عمل کرتے ہیں؟

کیا انسان کو زندہ رکھنے کا یہ عظیم کارنامہ اندھا اتفاق انجام دیتا ہے؟

کیا یہ عظیم مقصد بغیر قصد کے وجود میں آتا ہے؟

اس تناسب کو مختلف حالات میں قائم رکھنا کیا عظیم معجزہ نہیں ہے؟

چنانچہ ہم کبھی حرکت میں ہوتے ہیں، کبھی آرام کرتے ہیں، کبھی سو جاتے ہیں، کبھی دوڑتے ہیں، کبھی بلندی پر چڑھتے ہیں، کبھی اترتے ہیں، ان مختلف حالات میں اوکسیجن کا تناسب مختلف ہوتا ہے۔ ان تمام حالات میں ایک سو ارب خلیوں کو تناسب سے اوکسیجن فراہم کرنا کس قدر عظیم معجزہ ہے اور صرف مطلوبہ ضرورت کی اوکسیجن ہی فراہم نہیں کرتے بلکہ ضرر رساں CO_2 اور ہائیڈروجن پلک جھپکنے میں دور کر دیتے ہیں۔

سانس کی نالی میں جھلی کا ایک استر ہوتا ہے جو سانس کے دوران آنے جانے والی ہوا گرم رکھتا ہے۔ اس استر کے خلیے گرد و غبار کے ذرات جذب کر لیتے ہیں۔ سانس کی نالی کے کچھ پٹھے ہوتے ہیں جو ہوا کا راستہ کھولتے اور تنگ کرتے ہیں۔ گلے کی خراش یا کھانسی میں سانس کی نالی سکڑ کر تقریباً چھٹا حصہ رہ جاتی ہے۔ جب ہوا اس تنگ راستے سے گزرتی ہے تو اس کی رفتار معمول سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے تاکہ اگر اندر کوئی ذرات چپکے رہ گئے ہوں تو وہ صاف ہو جائیں۔

ہمارا ارادہ

آپ کا ارادہ کیسے نافذ العمل ہوتا ہے؟

آپ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ کوئی وزن اٹھاتے ہیں۔ یہ سب کیسے وقوع پذیر ہوتا ہے؟ آپ متوجہ نہیں ہیں کہ ان ارادوں کے نافذ ہونے کے لیے ایک نظام متحرک ہوتا ہے۔ آپ خیال کرتے ہیں کہ میں متحرک ہو رہا ہوں جب کہ ایک طاقت آپ کو متحرک کرنے کے لیے حرکت

میں آتی ہے۔ یعنی آپ کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آپ کے ارادے کے ہزارویں حصے میں آپ کو مطلوبہ توانائی فراہم کی جاتی ہے جس سے آپ حرکت کر رہے ہیں۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ اگر یہ توانائی آپ کو فراہم نہ کی جاتی تو آپ از خود ایک لفظ کا تلفظ بھی نہ کر سکتے۔

واضح رہے! ارادہ آپ کا ہے۔ عمل کرنا آپ کے بس میں نہیں ہے چونکہ عمل کرنے کے لیے درکار توانائی آپ کے پاس نہیں ہے۔ وہ توانائی دماغ کے کہنے پر فراہم کی جاتی ہے۔ اگر دماغ کا یہ حصہ مفلوج ہو جائے تو آپ ہزار ارادہ کریں نافذ نہیں ہوگا۔ جیسا کہ فالج زدہ لوگوں کا حال ہے۔

بہ ھرجا بنگرم کوہ و در و دشت
نشان از قامت رعنا تو بینم

خلیے کے بارے میں ڈاکٹر مائیکل ڈینٹن (Dr.Michael Denton) کی تشریح نہایت قابل توجہ ہے۔ ڈاکٹر مائیکل کا شمار بائیوکمیسٹری (Biochemistry) کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> خلیے میں جھانکنے کے لیے اسے دس لاکھ گنا بڑا کرنا پڑتا ہے۔ خلیے کو خلائی ٹیکنالوجی کی بہت بڑی بڑی مشینوں پر مشتمل لندن، نیویارک کی مانند بڑے شہر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔
>
> جب ہم نزدیک سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے چھوٹے چھوٹے کئی ملین دروازے کھلتے ہیں۔ ان میں سے کسی دروازے میں داخل ہوتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ یہاں ایک غیر معمولی اور مکمل ٹیکنالوجی موجود ہے۔

جگر

جگر ایک بہت بڑے کارخانے کی طرح کام کرتا ہے۔

یہ قابل قبول نہیں ہے کہ ایک مکمل ساز و سامان پر مشتمل مشینری جو نہایت معیاری ٹیکنالوجی کی حامل ہو صرف اتفاقاً از خود وجود میں آ گئی ہو۔ قابل توجہ ہے!

جگر کے ایک خلیے سے پانچ سو سے زیادہ مختلف کیمیکل اثرات صادر ہوتے ہیں اور یہ اونچے اور عمدہ ترین کیمیکلی اثرات ایک سکینڈ کے ہزارویں حصے میں انجام پاتے ہیں۔

جگر ہماری کھائی گئی غذائیں خلیوں کی ضرورت کے مطابق گلائکوجن (glyecogen) میں بدلتا

اور جلد کے نیچے گلوکوز کی شکل میں سٹور کرتا ہے۔ بعد میں جسم کو شکر کی ضرورت پیش آنے پر جسم کو فراہم کیے جانے والا گلوکوز، گلائکوجن ہی سے تیار ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہماری کھائی ہوئی غذائیں جگر جسم کی ضرورت کے مطابق مواد میں تبدیل کر کے جسم کو فراہم کرتا ہے اور باقی سٹور کر لیتا ہے۔ اس طرح جگر کے اربوں خلیے بغیر کسی غلطی کے پورے شعور و آگہی سے یہ کام انجام دیتے ہیں۔

جگر کی شعوری خدمات

جگر پانچ سو سے زیادہ حیات آفرین خدمات انجام دیتا ہے اور اگر ایک خدمت بھی ختم ہو جائے تو انسان مر جائے۔ ان میں سے چند اہم خدمات کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ انسان کی ہر حرکت و جنبش کو درکار توانائی کو ایندھن جگر ہی فراہم کرتا ہے۔

۲۔ مرغن غذا ہضم کرنے کے لیے جگر ہی مدد کرتا ہے۔

۳۔ انسان کو زندہ رکھنے کے لیے تقریباً ایک ہزار اقسام کے اینزائمز یعنی خامرے تیار کرتا ہے۔

۴۔ امراض کا مقابلہ کرنے والے کیمیائی ہتھیار (Antiboies) کی تیاری جگر کے ذمے ہے۔ اگر دشمن سے محفوظ رکھنے والا یہ ہتھیار جسم میں نہ ہوتا تو کرہ ارض پر انسان نام کوئی چیز نظر نہ آتی۔

۵۔ بعض پروٹین کے اجزاء آنتوں میں ایک خاص کیمیائی عمل سے گزرتے ہیں۔ یہ اجزاء اگر اسی حالت میں خون میں شامل ہو جائیں تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا مگر جگر اس جیسے مہلک اجزاء ایک پراسرار عمل سے گزار کر پروٹین میں تبدیل کرتا ہے۔ یہی اجزاء اگر ضرورت سے زیادہ ہوں تو جگر انہیں پیشاب کے ذریعے جسم سے خارج کر دیتا ہے۔ سبحان الخلاق العظیم۔

۶۔ ہمارے گردے جسم کی نمکیات ضائع ہونے سے بچانے کے لیے مخصوص ہارمون پیدا کرتے ہیں۔ ان کی پیداوار اگر ضرورت سے زائد ہو جائے تو جگر اس کے مضرات سے بچاتا ہے۔ اگر جگر یہ کام نہ کرے تو جسم پھول کر غبارہ بن جائے۔

۷۔ جگر دل کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ آنتوں سے حیات آفرین اجزاء لے کر آنے والا خون پہلے جگر میں آتا ہے پھر جگر خون کے یہ اجزاء ایک پیچیدہ کیمیائی عمل سے گزار کر دل میں داخل کرتا ہے۔ جگر سے ایک نالی دل میں کھلتی ہے۔ اس نالی کے ذریعے خون جگر سے گزر کر دل میں داخل ہوتا ہے۔ اگر ضرورت سے زیادہ خون جگر میں داخل ہو جائے تو جگر اسے اپنے میں جمع کر لیتا ہے۔ اگر اضافی خون اسی

طرح دل میں داخل ہو جائے تو دل کی دھڑکنیں اچانک بند ہوسکتی ہیں۔جگر چوبیس گھنٹے اس خطرے سے بچاتا رہتا ہے۔**کیا یہ عظیم مقصد بلا ارادہ انجام پا سکتا ہے!؟**

۸۔ زہریلے مواد کے اثرات بے اثر کرنے کی قابل قدر صلاحیت بھی جگر میں ہے۔ چنانچہ نیکوٹین (Nicotine) اور کیفین (caffeine) جیسے نقصان دہ اجزاء اور مختلف دوائیں جنہیں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں، اگر جگر سے گزارے بغیر براہ راست دل میں داخل ہونے والے خون میں شامل کر دی جائیں تو انسان فوری طور پر موت سے دوچار ہو جائے اور اگر ان مضر اجزاء کو جگر میں آنے والے خون میں شامل کر دیا جائے تو صرف دس سیکنڈ بعد وہ خون تمام اثرات سے پاک ہو چکا ہو گا۔ **کیا انسان کو ہر وقت موت سے بچا کر زندہ رکھنے والا جگر کسی قصد و ارادے کے بغیر اندھی نیچر سے اتفاقاً وجود میں آیا ہے!؟**

ہم نے بارہا ذکر کیا ہے کہ اتفاقیہ امور کبھی کبھار وقوع پذیر ہوتے ہیں مگر ایک بامقصد اور باحکمت آمیز نظام کے تحت ہمیشہ جاری و ساری رہنا اتفاق نہیں، عقل وشعور کا کام ہے۔

۹۔ جب انسان معمول سے زیادہ مشقت کرتے ہیں تو انسانی جسم کے پٹھے توانائی حاصل کرنے کے لیے جسم میں موجود گلوکوز تیزی سے جلاتے ہیں۔گلوکوز جلنے سے پیدا ہونے والا زہریلا مادہ ضائع کرنے کی بجائے جگر اسے دوسرے مثبت مادے میں تبدیل کر کے اسٹور کر لیتا ہے۔

۱۰۔کھائی جانے والی میٹھی چیزوں میں موجود شکر آنتوں میں جا کر گلوکوز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ گلوکوز زیادہ مقدر میں خون میں شامل ہو جائے تو انسان پر بے ہوشی طاری ہوسکتی ہے۔جگر کی کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا نہ ہو۔

۱۱۔خون کے خلیوں کی عمر ایک سو بیس دن ہوتی ہے اور ہر سکینڈ میں خون کے ایک کروڑ خلیے مر جاتے اور اتنے نئے خلیے پیدا ہوتے ہیں۔

جگر کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ان مردہ خلیوں کی لاشیں ضائع کرنے کی بجائے انہیں نئے خلیے بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ کچھ باقی ماندہ خلیوں سے روزانہ کی ضرورت کا دسترخوان تیار کرتا ہے۔

۱۲۔جگر انتہائی نامساعد حالات میں بھی کام کرتا ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ اگر پچاسی فیصد جگر کسی بیماری کی وجہ سے تباہ ہو جائے، پھر بھی جگر کی کارکردگی میں فرق نہیں آتا۔ اگر جگر کا ایک حصہ کاٹ دیا جائے تو چند ماہ میں اپنی پہلی حالت میں آ جاتا ہے۔

اے انسان! جگر جیسا عظیم معجزہ تجھے ہر آن تباہی سے بچاتا ہے اور تجھے خبر بھی نہیں۔

معدے کے خلیوں کا حیرت انگیز شعور

معدے میں منتقل ہونے والی ہضم شدہ غذا میں کھٹاس و تیزابیت ہوتی ہے جو آنتوں کو ضرر پہنچاتی ہے۔ آنتوں کی ساخت معدے سے مختلف ہوتی ہے اور اس تیزابیت کو برداشت نہیں کرسکتی۔ آنتوں کو اس ضرر سے کیسے محفوظ کیا جاتا ہے، قابل توجہ ہے۔ جب یہ کھٹاس مضر ہونے کی حد تک پہنچ کر آنتوں میں پہنچتی ہے تو آنتوں سے ایک محیر العقول ردعمل ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ایک قسم کے ہارمون مترشح کرتی ہیں جنہیں سیکریٹن (secretin) کہتے ہیں۔ اس ترشح کی وجہ سے اس کا ضرر ختم ہو جاتا ہے۔

خلیوں کا مواصلاتی نظام

ہمارے جسم میں موجود اربوں سیلز آپس میں مربوط اور منظم ہیں اور اس نظم کی ذمہ داری ہے کہ خلیوں کی فعالیت کی نگرانی کرے۔

چنانچہ اس تنظیم کو قائم رکھنے کے لیے پیغام رساں ہارمونز تیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم کے ہارمونز تمام خلیوں کی فعالیت چیک کرتے ہیں۔ اسی طرح انسولین والے ہارمونز جسم میں شوگر تمام خلیوں تک پہنچاتے ہیں اور الڈسٹرن (Aldosterone) نامی ہارمونز خون میں نمک اور پانی میں توازن برقرار رکھتے ہیں۔

اس طرح سینکڑوں ہارمونز خلیوں میں رابطے کا کام کرتے ہیں اور یہ نظام نہایت دقیق اور معیاری انداز میں قائم ہے۔ ان ہارمونز کے بغیر جسم میں منظم کارکردگی ممکن نہیں ہے۔ یہ ہارمونز نہ ہوتے تو جسم میں نہایت بدنظمی اور دگرگونی ہوتی۔

الحادی نظریہ رکھنے والوں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان خلیوں کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے خلیوں کو کیا کرنا چاہیے اور ضروری تناسب قائم رکھنے کے لیے کس قسم کے ہارمونز تیار کرنے ہیں؟ ان خلیوں کو اس کا علم کیسے حاصل ہوا؟

اس سوال اور اس طرح کے بے شمار دیگر سوالات کا جواب یہی ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی خلائق کو شعور دینے والا اللہ تعالیٰ ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز پر اس کی حکومت و اقتدار قائم ہے۔

گردے

گردے اپنے شعور سے گلوکوز، پروٹین اور سوڈیم اچھی طرح پہچانتے ہیں جو اس ذات کی

خلاقیت پر واضح دلیل ہے جس نے انہیں یہ شعور دیا ہے۔

گردے ہمارے پورے جسم میں گردش کرنے والے خون کی صفائی کرتے ہیں۔ اس صفائی کے بعد باقی رہنے والے والا مواد جسم سے باہر پھینک دیتے ہیں اور صاف شدہ خون جسم میں واپس کر دیتے ہیں۔

گردے پروٹین، پیشاب، سوڈیم اور گلوکوز میں فرق کیسے پہچانتے ہیں؟

جس جگہ خون کا تصفیہ ہوتا ہے وہ گردے کی ایک خاص گول سی جگہ ہے۔ خون کی یہ جگہ باقی جگہوں سے مختلف ہے۔ یہ جگہ تین سطحوں میں گھری ہوتی ہے۔ ان تین سطحوں کا کام یہ ہے کہ ان مواد کا تعین کریں جنہیں خون میں واپس جانا ہے اور ان کا بھی جنہیں جسم سے باہر پھینکنا ہے۔ یعنی یہ شعور رکھتے ہیں کہ کون سے مواد خون میں واپس جانے ہیں اور کون سے جسم سے باہر خارج کرنے ہیں۔

ان سطحوں نے کسی یونیورسٹی میں فزکس اور کیمیکلز میں پی ایچ ڈی نہیں کی۔ انہیں یہ سوجھ بوجھ کس نے دی کہ وہ گلوکوز، پروٹین اور یوریا وغیرہ میں تمیز کر لیتی ہیں؟

گردوں کے فرائض

گردے درج ذیل فرائض پوری ذمے داری سے انجام دیتے ہیں:

۱۔ گردوں سے گزرنے والے جسم کے سارے خون کی صفائی کرتے ہیں۔

۲۔ خون سے فالتو زہریلے مادے الگ کرتے ہیں۔

۳۔ خون کے سرخ خلیوں کی تیاری میں مدد کرتے ہیں۔

۴۔ جسم میں موجود پوٹاشیم، سوڈیم، کلورائیڈ اور دوسرے کیمیائی مادوں کی مقدار پر نظر رکھتے ہیں۔ اس مقدار میں کمی بیشی کی صورت میں زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

۵۔ جسم میں پانی کی مقدار اعتدال میں رکھتے ہیں۔ پانی کے اعتدال میں فرق آنے سے جسم کے خلیے متاثر ہوتے ہیں۔

۶۔ خون میں تیزابی مادوں کی مقدار پر نظر رکھتے ہیں۔

۷۔ خون میں نمکیات کی مقدار پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

۸۔ خون کے سرخ خلیوں کی پیداوار میں مدد فراہم کرنے والے ہارمون پیدا کرتے ہیں۔

۹۔ بلڈ پریشر معمول پر رکھنے کے لیے دوسرے قسم کے ہارمون تیار کرتے ہیں۔[۱]

کیا یہ سب بے شعوری کے نتائج، بے مقصد ظاہر ہونے والے مقاصد اور بلاارادہ حیرت انگیز حکمت ہے اور اندھا مادہ یہ سب کچھ کرسکتا ہے؟!

یا

یہ سب اس رب کریم کی کرشمہ سازی ہے جس کے بارے میں خود ارشاد فرمایا ہے:

رَبُّنَا الَّذِيٓ اَعۡطٰى كُلَّ شَيۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔[۲]

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر ہدایت دی۔

یہ ہادی برحق کی تفویض شدہ ہدایت تکوینی ہے۔

گردوں میں نظام فشار خون

انسانی جسم میں فشار خون بالا پائیں ہونے کا نظام بھی انہی گردوں میں ہے۔ اگر شریانوں میں خون کی مقدار ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو جسم بلند فشار خون کا شکار ہو جاتا ہے جو انسان کے لیے ضرر رساں ہے۔

جسم کی شریانوں میں معمول سے زیادہ خون آ جائے تو دل کے جس خانے میں اس خون نے داخل ہونا ہے اس میں داخل ہونے کی اجازت دیتے وقت دماغ کو اس صورت حال کی اطلاع دی جاتی ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی دماغ گردوں کی طرف جانے والی شریانوں کو حکم دیتا ہے کہ خون کی صفائی کا عمل تیز کیا جائے چونکہ فشار خون معمول سے زیادہ ہونے کی صورت میں انسان کی جان جانے کا خطرہ ہے۔

خون کی صفائی کا عمل

تقریباً صرف پانچ اونس وزن کی جگہ پر ایک فلٹر پلانٹ نصب ہے جو دس لاکھ چھلنیوں پر مشتمل ہے۔ ان چھلنیوں سے گزار کر انسانی جسم کا خون ایک گھنٹے میں دو مرتبہ صاف کیا جاتا ہے۔

یہ چھلنیاں خون میں موجود ۹۹ فیصد مواد دوبارہ اپنے میں جذب کر لیتی ہیں۔ ان چھلنیوں میں یہ شعور ہے کہ زندگی کے لیے ضروری مواد کون سے ہیں جیسے وٹامنز، گلوکوز، ہارمونز اور دوسرے مواد۔ انہیں

---

[۱] اقتباس از جسم کے عجائبات۔
اس کتاب میں انسانی جسم سے متعلق اکثر معلومات کتاب جسم کے عجائبات تالیف جے ڈی ریٹ کلف۔ ترجمہ جناب محمد علی سید سے اقتباس ہیں۔

[۲] سورة طٰه: ۵۰

یہ دوبارہ خون میں بقدر ضرورت شامل کرتی ہیں۔ اگر یہ مواد ضرورت سے زیادہ ہوں تو پیشاب کے ذریعے خارج کر دیتی ہیں۔

اسی طرح ضرورت سے زیادہ مٹھاس اور نمک جسم سے خارج کرتی ہیں۔

گوشت اور پھلوں سے حاصل ہونے والی پوٹاشیم پر بھی گردے نظر رکھتے ہیں۔ ان کے کم ہونے سے پٹھے کمزور ہوجاتے ہیں۔ خاص طور پر سانس لینے میں مدد دینے والے پٹھے کمزور ہو جاتے ہیں۔

اگر پوٹاشیم کی مقدار زیادہ ہو جائے تو دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو جاتی ہیں اور حرکت قلب بند ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس اضافی پوٹاشیم کو جسم سے خارج کر دیتے ہیں۔ اگر اس میں کمی ہو تو کفایت شعاری سے استعمال کرنا یقینی بناتے ہیں۔

سب سے اہم کام جو گردے انجام دیتے ہیں وہ یوریا اعتدال میں رکھنا ہے۔ یوریا کم ہو تو اس کا مطلب ہے جگر میں کوئی خرابی ہے۔ یوریا لحمیات ہضم ہونے کے دوران پیدا ہوتا ہے۔ یوریا زیادہ ہو تو خطرناک بیماری لاحق ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ بے قصد مادہ عظیم مقصد کیسے انجام دیتا ہے !؟

خون کی صفائی کے دوران پیشاب بنتا رہتا ہے۔ روزانہ تقریباً تین لیٹر پیشاب کے نہایت چھوٹے چھوٹے قطرے گردوں کی دس لاکھ چھلنیوں سے گزر کر گردے کے درمیانی حصے میں جمع ہوتے ہیں۔ یہاں سے پیشاب دو باریک نالیوں کے ذریعے مثانے میں چلا جاتا ہے۔

دماغ سے پیغام ملنے کے بعد گردے سیال مادہ جسم سے خارج کرنے لگتے ہیں تاکہ فشار خون اعتدال پر آ جائے۔ گردوں کی فعالیت نہایت حیران کن ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے جسم میں جو کچھ ہے سب اللہ کے حکم کی تعمیل میں مگن ہے اور جسم کے تمام ذرات میں شعور اللہ تعالیٰ کا عنایت کردہ ہے۔

مثانہ

انسانی جسم کے خون کی صفائی گردوں کے ذمے ہے۔ اس صفائی سے سے بچنے والا فالتو پانی اور زہریلے مادے گردوں سے مثانے میں منتقل ہوتے ہیں۔

اگر جسم سے خارج ہونے والا پانی دوسرے ذرائع سے خارج ہو جائے۔ مثلاً دھوپ میں زیادہ

دیر تک کام کرنے سے جسم کا پانی پسینے کے ذریعے نکل جائے تو پیشاپ گاڑھا، کم اور گہرا زرد ہو جاتا ہے۔

انسان کے تقریباً تمام اعضاء اپنے فضلے پیشاب کے ذریعے خارج کرتے ہیں۔ حاملہ ماں کے زائد ہارمون پیشاب کے ذریعے خارج ہوتے ہیں۔ چنانچہ پیشاب ہی کے ذریعے آنے والے مولود کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

پیشاب کا جسم سے نکلنا اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ہے۔ آپ کے پیئے ہوئے پانی سے جسم کے تمام اعضاء اپنی ضروریات پوری کرتے اور زہریلا فضلہ خارج کرتے رہتے ہیں چونکہ جسم کو سیراب کرنے والا پانی زہریلے مادوں سے آلودہ ہو جاتا ہے۔

مثانے کے دو منہ ہوتے ہیں۔ جب پہلا منہ بھر جاتا ہے تو یہ کھل جاتا ہے اور اس کے بھر جانے سے انسان کو پیشاب کی حاجت ہوتی ہے مگر دوسرے منہ کا کھولنا انسان کے اختیار میں رکھا گیا ہے تاکہ پیشاب کرنے کے لیے مناسب جگہ جا سکے۔ اگر یہ انسان کے اختیار میں نہ ہوتا تو انسان ناقابل تحمل مشکلات سے دوچار ہو جاتا۔

اندھی نیچر کو کیا پرواہ تھی کہ انسان مشکلات سے دوچار ہو جائے !؟

اندھی نیچر اس قدر مہربان اور احترام آدمیت کا اس قدر خیال رکھے کہ مثانے کا دوسرا منہ پہلے منہ کی طرح خود بخود کھل جاتا تو انسان کو خفت اٹھانا پڑتی !؟

کیا یہ بے شعور نیچر انسان پر اس قدر مہربان ہے؟

دردزہ اور ماں کا دودھ

جب ماں کے شکم میں بچے کے نو ماہ پورے ہوتے ہیں تو دماغ سے ہارمونز مترشح ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان ہارمونز کے دو کام ہوتے ہیں:

حمل کے ایّام مکمل ہونے پر ماں کے سینے میں دودھ مترشح کرنے والے غدود کو حکم ملتا ہے کہ نیا مہمان آنے والا ہے اس کے لیے اپنے سینے پر پیار بھرا دسترخوان بچھائیں۔

جب بچے کی پیدائش کا وقت آتا ہے تو رحم کے منہ سے دماغ کو پیغام ارسال ہوتا ہے اور دماغ اس پیغام کے ملتے ہی فوراً ایک خاص قسم کے ہارمونز پیدا کر کے رحم کے منہ کی طرف روانہ کر دیتا ہے۔ ہارمونز کے رحم کے منہ کے پاس آتے ہی ولادت کا عمل انجام پاتا ہے۔

یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ رحم کے منہ میں موجود سیلز کو یہ شعور کہاں سے ملا کہ ولادت کا وقت نزدیک ہونے کا پیغام دماغ کو پہنچائیں؟

دماغ کو کیوں؟ دوسرے اعضاء کو کیوں نظر انداز کیا؟

۲۔ دماغ نے کیسے سمجھا کہ پیغام رحم کے ہاں سے آرہا ہے؟

۳۔ دماغ ولادت کے لیے مطلوبہ ہارمونز کیوں پیدا کرتا ہے؟

۴۔ ان ہارمونز کو رحم مادر کی طرف کیوں بھیجتا ہے؟

۵۔ یہ ہارمونز دماغ سے رحم مادر تک کی مسافت بغیر کسی غلطی کے کیسے طے کرتے ہیں؟

۶۔ یہ ہارمونز صرف رحم مادر کی طرف کیوں آتے ہیں؟

اس تمام حکمت آمیز شعور کا صرف ایک جواب ہے کہ یہ خداوند قادر، خلاق عالم کی لامحدود قوت وقدرت کا کرشمہ ہے۔

پیاس کیوں لگتی ہے؟

ہمارا جسم ایسے نظام پر قائم ہے جس کے تحت جسم میں پانی کی مقدار کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اس اہم نظام کا مرکز دماغ میں ہے جسے ''متوسط دماغ'' (Midbrain) کہتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری خون میں پانی کے تناسب پر نظر رکھنا ہے۔ خون میں پانی کی کمی ہونے سے خون کے دباؤ میں کمی آجاتی ہے اور فشارِ خون کم ہونے کی دماغ کو اطلاع دی جاتی ہے۔ دماغ کو جیسے اطلاع ملتی ہے یہ ضروری تدابیر اختیار کرنے لگتا ہے اور اپنے نیچے موجود غدود کو حکم دیتا ہے۔ یہ حکم ملتے ہی غدود ایک قسم (ADH) کے ہارمونز پیدا کرنا شروع کرتے اور انہیں ترشح کا حکم دیتے ہیں۔

چنانچہ یہ ہارمونز طویل سفر پر نکلتے ہیں اور خون کے ساتھ گردوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ گردوں میں اس قسم کے ہارمونز کے استقبال کا نظام موجود ہے جو ان ہارمونز کے ساتھ ایسے سازگار ہے جیسے چابی تالے سے۔ جب یہ ہارمونز گردوں میں پہنچ جاتے ہیں تو گردوں کو پیغام ملتا ہے جس میں پانی میں تناسب قائم کرنے کے لیے کہا گیا ہے جس کے تحت ہمیں پیاس لگنا شروع ہو جاتی ہے اور ہم پانی کا ایک گلاس

پی لیتے ہیں۔ اگر ہمارے جسم میں موجود نظام سے خون میں پانی کا تناسب قائم رکھنے کا حکم نہ دیا جاتا تو جسم کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہیں:

ا۔ اگر عقل و شعور کی حکمرانی نہ ہوتی تو دماغ غدود کو، غدود ہارمونز کو کیوں ہدایات جاری کرتے؟

اگر قصد و شعور نہ ہوتا، ہارمونز گردوں کا رخ کیوں کرتے اور گردوں کو پانی کا تناسب قائم رکھنے کا حکم کیوں ملتا؟

حالت خوف۔ ایمرجنسی

اگر انسان خوفزدہ ہو جائے تو اعصابی خلیے حرکت میں آتے ہیں اور گردوں پر موجود غدود کو حکم دیتے ہیں۔ یہ حکم ان غدود تک راستہ بھٹکے بغیر پہنچ جاتا ہے۔ جیسے ہی یہ پیغام غدود کو ملتا ہے وہ فوراً ایک قسم کے ہارمونز صادر کرنا شروع کرتے ہیں۔ یہ ہارمونز خون میں شامل ہو کر ہضم کی کارکردگی ماند کر دیتے ہیں اور ہضم کے لیے درکار خون اعصاب میں منتقل ہو جاتا ہے تاکہ اعصاب کو تقویت ملے۔ ساتھ ساتھ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور فشار خون میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس سے اعصاب کو تقویت ملتی ہے اور ساتھ آنکھوں کے موتی کو زیادہ آکسیجن فراہم کی جاتی ہے تاکہ آنکھوں میں زیادہ طاقت آجائے۔

ان تمام کی فراہمی کی صورت میں انسان خوف میں بہتر مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ خواہ بھاگنے کی صورت ہو یا دفاع یا حملے کی۔

پھیپھڑے

پھیپھڑوں میں دفاع کے لیے ایک لشکر تیار رہتا ہے۔ چنانچہ بعض خلیے اس وقت قاتل مرکب مترشح کرتے ہیں جب جراثیم اور بیکٹیریا کا حملہ ہوتا ہے اگر یہ جراثیم ابتدائی دفاعی مرحلے سے گزر کر یہاں آ گئے ہوں۔

یہ خلیے بیرون سے آنے والے ضرر رساں جراثیم کی کس طرح شناخت کرتے ہیں کہ ان میں ضرر ہے اور کس طرح قاتل مرکب مترشح کرتے ہیں کہ یہ جراثیم ہلاک ہو جائیں؟

جواب یہ ہے: کسی قدیر و بصیر ذات کا دیا ہوا شعور ہے۔

انسانی جسم ایک سیکنڈ میں ۱۲۵ ملین خلیے خرچ کرتا ہے۔ یعنی ایک منٹ میں ۷۵۰۰ ملین خلیے۔
بعض خلیے صرف چند دن زندہ رہتے ہیں اور دماغ کے خلیات نہیں بدلتے۔
پھیپھڑے میں موجود ننھی منی تھیلیوں کو پھیلا دیا جائے تو ان کا حجم ستر میٹر ہوگا۔

سانس لینے کی نالی چار انچ لمبی ہوتی ہے۔ نیچے جا کر دو شاخوں میں بٹ کر دونوں پھیپھڑوں میں جاتی اور بے شمار نالیوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ یہ شاخیں پتلی ہو کر ایک انچ کے سو وین حصے کے برابر ہو جاتی ہیں۔

اسی مرحلے میں مختلف گیسوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ خون کے سرخ خلیوں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ نکال کر اس کی جگہ تازہ آکسیجن بھر دی جاتی ہے۔

پھیپھڑے ننھی منی تھیلیوں سے عبارت ہیں۔ دل سے پمپ ہو کر آنے والا خون انہی باریک نالیوں سے پھیپھڑوں میں داخل ہوتا ہے۔ خون کے سرخ خلیے جب ان باریک نالیوں سے گزرتے ہیں تو ان میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ ان نالیوں کی اندرونی سطح پر بچھی ہوئی جھلی میں جذب ہوتی رہتی ہے اور عین اسی وقت خالی ہو جانے والے خون کے سرخ خلیے ان ننھی تھیلیوں میں موجود تر و تازہ ہوا کے ساتھ آنے والی آکسیجن اپنے میں بھرتے ہیں۔

ہماری ہر سانس کے ساتھ بے شمار اقسام کے بکٹیریا، وائرس اور جراثیم سانس کی گزرگاہ میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ناک اور حلق میں ہی تباہ کر دیے جاتے ہیں۔ یہ کام جراثیم کش رطوبتیں انجام دیتی ہیں جو ناک اور حلق میں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ اگر کوئی جرثومہ ان چوکیوں سے بچ کر پھیپھڑوں میں پہنچ جائے اسے پھیپھڑوں میں گھومنے والے سفید خلیے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ وہ اس تاریکی میں بھی دشمن دیکھ لیتے ہیں۔ دیکھتے ہی ان پر ٹوٹ پڑتے اور انہیں نابود کر دیتے ہیں۔

ان خلیوں کو کیا بے شعور اتفاق نے شعور دیا یا ناسمجھ نیچر نے سمجھایا !؟

ہوا جو گاڑیوں کے دھویں اور دیگر طرح طرح کی گیسوں سے آلودہ اور پھیپھڑوں کے لیے بہت مشکلات پیدا کرتی ہے، کی صفائی کا اہتمام قدرت نے فرمایا ہے۔ چنانچہ ناک سے صفائی کا کام شروع ہوتا ہے۔ سانس کے ساتھ آنے والے گرد و غبار کے بڑے ذرات نمی میں ڈوبی ہوئی ناک کے بالوں سے چپک جاتے ہیں۔ چنانچہ وضو سے پہلے تین بار ناک میں پانی ڈالنا مستحب ہے۔ اس کے بعد ناک کی

صفائی کا مائکروسکوپی نظام سیلیا جو لاکھوں کروڑوں خورد بینی بالوں پر مشتمل ہے لاکھوں تنکوں والی جھاڑو کی طرح اس آلودگی کو سمیٹ کر حلق میں گراتا رہتا ہے جہاں سے یہ آلودگی معدے میں چلی جاتی ہے اور معدے کے تیزابی مادے اس زہریلے فضلے کو چند منٹوں میں مناسب طور پر ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔

دفاعی فوج

اگر باہر سے ہمارے جسم میں جراثیم داخل ہوں تو ان پر ٹوٹ پڑنے اور انہیں مارنے کے لیے خلیے ہر وقت ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور انہیں ختم کرتے ہیں۔ اگر جسم پر کوئی زخم لگتا ہے تو اس زخم کو مندمل کرنے کے لیے احتیاطی خلیے دوڑ پڑتے ہیں اور زخم کی جگہ ضائع ہونے والے خلیے پر کرتے ہیں اور زخم مندمل ہو جاتا ہے۔

ان خلیوں کو اس حادثے کا فوراً علم ہو جاتا ہے اور فوراً محل حادثہ پر پہنچ جاتے ہیں اور کسی قسم کی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔

سوال یہ ہے: ان خلیوں نے جب پہلی بار باہر سے آنے والے جراثیم کو دیکھا تو کیسے پہچان لیا کہ یہ جرثومے مضر ہیں اور انہیں کیوں ختم کرتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان خلیوں کو قوت شناخت و دفاع عطا کی ہے ورنہ بذات خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھے۔

چنانچہ ہمارے جسم میں دوسو بلین دفاعی لشکر مہلک ہتھیاروں سے مسلح ہے اور ایسا اسٹریٹیجیک قتالی نظام موجود ہے کہ روئے زمین پر اس قسم کا دفاعی نظام موجود نہیں ہے۔

انسانی جسم میں آنے والے بیرونی دشمنوں سے مقابلے کے لیے ایک مستعد فوج موجود ہے جو ہر آنے والے حملہ آور کو حملہ کرنے سے پہلے ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ یہ دفاعی فوج سفید اور سرخ خلیے ہیں۔

جسم میں یہ خلیے ۷۵۰۰۰ میل لمبی خون کی رگوں میں دشمن کی تاک میں ہوتے ہیں اور اسے دیکھتے ہی اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

خودکش حملہ

دفاع کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دشمن کو دیکھتے ہی اس سے چپک جاتے ہیں جس سے اس جرثومے کی موت واقع ہو جاتی ہے اور خود سفید خلیے بھی مر جاتے ہیں۔

اگر یہ دشمن جرثومہ زیادہ طاقتور ہے تو بہت سے سفید خلیے مل کر ایک بڑا سفید خلیہ بناتے ہیں

اور بیماری کے جرثومے کو ہر طرف سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ بے بس ہو جاتا ہے۔

بیماری کے کچھ جراثیم ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں سفید خلیے شناخت نہیں کر پاتے۔ ان جرثوموں کو خون میں تیرتے دیکھ کر ایک خاص خلیوں کی احتیاطی فوج سامنے آتی ہے اور انہیں پکڑ کر قریبی چوکی ٹی سیل (T Cell) میں پیش کر دیتی ہے۔

ٹی سیل کی یادداشت بڑی حیران کن ہے کہ جو بھی جرثومہ زندگی کے کسی حصے میں جسم میں داخل ہو جائے ٹی سیل اسے کبھی نہیں بھولتا۔ اسے یہ بھی یاد ہوتا ہے کہ اس قسم کا جرثومہ کس اینٹی باڈی کے ذریعے تباہ کیا گیا تھا۔سبحان الخبیر البصیر۔

چنانچہ ٹی سیل پچاس سال بعد بھی دوبارہ جسم میں آنے والے جرثومے کو پہچان کر اسے دفاعی فوج کے حوالے کر دیتے ہیں۔

بعض دفاعی خلیے دشمن سے کیمیائی جنگ لڑنے کے لیے دس لاکھ سے زیادہ اقسام کے کیمیائی ہتھیار یعنی اینٹی باڈیز پیدا کرتے ہیں اور میدان جنگ میں جھونک دیتے ہیں۔

وَكَأَيِّن مِّنْ ءَايَةٍ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ۔[1]

اور آسمانوں اور زمین میں (اللہ کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ بغیر اعتنا کے گزر جاتے ہیں۔ صدق اللہ العلی العظیم

خون ریزی ہو جائے

خدا نہ کرے اگر کوئی حادثہ پیش آ جائے، کوئی عضو زخمی ہو جائے اور خون بہنے لگے تو خون کے جتھے اس طرف دوڑ پڑتے ہیں جیسے ایمرجنسی ایمبولینس فوراً پہنچ جاتی اور فرسٹ ایڈ کا کام کرتی ہے۔ یہ خون کے مختلف مقامات پر موجود ہوتے ہیں۔ جب بھی کوئی حادثہ پیش آتا ہے یہ اسی وقت حاضر ہو جاتے ہیں۔

تعجب کا مقام ہے کہ جب حادثہ پیش آتا ہے تو کچھ پروٹین ٹریفک پولیس کا کام کرتے ہوئے خون بہنے کی جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ خون ریزی کو روکا جائے۔

جب خون کا پہلا جتھا اس جگہ پہنچتا ہے تو دوسرے جتھوں کو اطلاع دیتا ہے کہ حادثے کی جگہ فوراً پہنچیں۔ اس دوران چند انزائمز زخم میں پروٹین پیدا کرتے ہیں۔ ان پروٹینز کے پیدا ہونے سے زخم پر تہ جمنے لگتی ہے اور زخم مندمل ہو جاتا ہے۔

[1] سورة يوسف: ١٠٥

توکیا یہ نظام، یہ شعور، یہ ادراک اور یہ تدارک کسی بے شعور اندھے اتفاق سے صادر ہوتا ہے۔ اگر اتفاقیہ ہے اتفاقاً وجود میں آتا، ہمیشہ پابندی سے وجود میں نہ آتا۔

ستونِ جسم۔ ذرائع مواصلات

انسان کی ریڑھ کی ہڈی انسانی جسم کا ستون ہے جس پر انسانی ڈھانچہ کھڑا رہ سکتا ہے، چل سکتا ہے۔ دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہیں، چلنے کے لیے جانوروں کی طرح ہاتھوں کا سہارا لینا نہیں پڑتا۔

سیدھا کھڑا ہونے کی صورت میں ریڑھ کی ہڈی کو جھکنے، مڑنے اور مختلف زاویوں میں حرکت کرنی پڑتی ہے اور پورے جسم کا وزن بھی برداشت کرتی ہے۔

ریڑھ کی ہڈی نہ صرف جسم کے ستون کا کام کرتی ہے بلکہ ایک اور نہایت اہم کام انجام دیتی ہے: دماغ سے پاؤں تک پھیلے ہوئے انتہائی نازک موصلاتی نظام کو بھی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ یہ مواصلاتی نظام نسبتاً ایک موٹی تار کے ذریعے قائم ہے۔ اس تار میں لاکھوں تاریں ہوتی ہیں۔ یہ نازک اور باریک تاریں ہمارے اعصابی نظام کا حصہ ہیں۔ یہ تاریں حرام مغز سے گزرتی ہیں اور بے شمار اعصاب حرام مغز سے سارے جسم میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ان میں تھوڑی خرابی آ جائے تو انسان زمین گیر ہو کر رہ جاتا ہے۔

دماغ سے صادر ہونے والے کھربوں احکام جسم کے تمام حصوں میں اسی حرام مغز کے ذریعے پہنچتے ہیں اور حرام مغز کے ذریعے ہی پورے جسم سے اربوں اطلاعات دماغ کو فراہم کی جاتی ہے۔ اگر ان احکام اور اطلاعات کا تبادلہ منقطع ہو جائے تو جسم کا سارا نظام ناکارہ ہو جائے۔

ہماری ریڑھ ۳۳ مہروں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اوپر کے سات موہرے انسان کو اس قابل بناتے ہیں کہ اپنی گردن ۱۸۰ زاویے میں گھما سکے۔ ہمارے سر کا وزن بھی یہی مہرے سنبھالتے ہیں۔ ۱۳۶

درمیانی مہروں کی تعداد بارہ ہوتی ہے۔ انہیں کم حرکت کرنی پڑتی ہے۔ یہ مہرے پسلیوں کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔

آخری مہروں کی تعداد پانچ ہے۔ یہ مہرے زیادہ طاقتور بنائے گئے ہیں کیونکہ جسم کا زیادہ وزن انہی پر ہوتا ہے۔

ان پانچ مہروں کے آخر میں ڈڈی کی ہڈی ہے۔ یہ ہڈی پانچ مہرے جوڑ کر بنائی گئی ہے۔ اس طرح اس سلسلے کا نچلا حصہ بہت پر مشقت ہے۔

کیا ریڑھ کی ہڈی کی ساخت میں کسی قصد وارادے کا دخل نہیں ہے؟
کیا بے قصد و ارادہ چیزوں سے یہ مقصد و مراد پوری ہوتی ہے !؟
واضح رہے ان تمام دروس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اگر خلقت کا کوئی مقصد نہیں ہے تو قصد نہیں ہے۔ تخلیقی نظام میں کوئی مراد نہیں ہے تو کوئی ارادہ کارفرما نہیں۔
ہم نے ان تمام دروس میں خلقت میں موجود حکمت اور مقاصد کی نشاندہی کی ہے۔ اسی سے قصد وارادے کا کارفرما ہونا ثابت ہوتا ہے۔

ہڈی

ہڈی ہمارے جسم کا ڈھانچہ سنبھالنے کا کام تو دیتی ہی ہے لیکن ہڈیوں کی دیگر افادیت اور ضرورت نہایت اہمیت کی حامل ہے۔

غذا کے ذریعے جسم میں داخل ہونے والی معدنیات ہڈیوں میں سٹور ہوتی ہیں۔ ہڈیاں معدنیات ذخیرہ کرنے کا اہم سٹور ہیں جن میں روزانہ کچھ مال جمع اور کچھ نکلتا ہے۔ اس سٹور کو یہ شعور وادراک ہے کہ جسم کو کس وقت کس چیز کی ضرورت ہے۔

ہڈی کے گودے کو ایک کارخانہ سمجھ لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کارخانے کی پیداواری طاقت نہایت محیر العقول ہے۔

چنانچہ صرف ایک منٹ میں خون کے ۱۸۰ ملین سرخ خلیے ختم ہو جاتے یعنی مر جاتے ہیں۔ ان کی جگہ اتنی مقدار میں نئے خلیے پیدا کرنا ہڈیوں کے ذمے ہے۔ انسان کی تلی اور جگر بھی خلیے فراہم کرتے ہیں مگر کم مقدار میں۔

باہر سے آنے والی بیماری کے جراثیم کا قلع قمع کرنا بھی ہڈیوں کا کام ہے۔ اگر ہڈیوں کا دفاعی انتظام نہ ہوتا تو انسان چند دنوں میں دنیا سے رخصت ہو جاتا۔

کیلشیم ذخیرہ کرنے پھر اسے حسب ضرورت تناسب سے تقسیم کرنے کا کام بھی ہڈیوں کے سپرد ہے۔ چنانچہ گردشِ خون کے دوران کیلشیم میں کمی آجائے تو اس کمی کو اپنے سٹور سے فراہم کرنے کا کام ہڈی انجام دیتی ہے۔

خون میں کیلشیم کا کردار زندگی کی بقاء کے لیے بہت اہم ہے۔ اس کے بغیر جسم اور دماغ کے

درمیان مواصلاتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

گردن کے غدود کا شعوری کردار

جسم کو کیلشیم کی فراہمی اعتدال میں رکھنے کی ذمہ داری گردن میں موجود غدود پر ہے جو گردشِ خون میں ایک خاص ہارمون جاری کرتے ہیں۔ اس ہارمون میں یہ حکم موجود ہوتا ہے کہ اپنے کیلشیم کے ذخائر سے کچھ نکال کر خون میں شامل کریں۔

اگر کیلشیم کی مقدار ضرورت سے زیادہ ہو تو ایک قسم کے ہارمون آگے آتے ہیں جن سے ہڈیاں خون کی گردش میں زائد کیلشیم اپنے میں ذخیرہ کرنے لگتی ہیں۔

خلیے کا شعوری کردار

ہڈی ٹوٹنے کی صورت میں خلیے زیادہ مقدار میں ایک خاص پروٹین پیدا کرتے اور اسے ٹوٹی ہوئے جگہ پر ڈال دیتے ہیں۔ اس پروٹین میں خون کی گردش کے ذریعے آنے والے معدنی اجزاء لگاتار آ کر چپکتے اور جمتے ہیں۔ اس طرح ٹوٹی ہوئی ہڈی دوبارہ مندمل ہو جاتی ہے۔

خلیے کے شعور میں ایک اور قسم کے خلیوں کا کردار حیرت انگیز ہے۔ ان خلیوں کو ہڈی کی پرانی شکل وصورت کا علم ہے۔ ہڈی کے مندمل ہونے کے عمل کے دوران یہ خلیے ان ناہموار حصوں کو کھرچ کر اضافی مصالحہ ہضم کر جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اس ہڈی کا کھردرا پن مریض کے گوشت سے رگڑ کھانے کی وجہ سے اسے شدید تکلیف دے سکتا ہے۔ اس لیے یہ خلیے ان مقامات کو تراش کر ہموار کر کے اصلی حالت میں واپس لے آتے ہیں۔

کیا یہ کسی بے شعور کا کوئی ہدف ہو سکتا ہے!؟

ہاتھ

جسم کے کسی عضو کی اہمیت کا اندازہ دماغ کے اس حصے سے ہوتا ہے جو اس عضو سے مختص ہے۔ چنانچہ دماغ میں ہاتھوں کے لیے بڑی جگہ مخصوص ہے۔

آپ اپنے انگوٹھے کو تھوڑی سی جنبش دیتے ہیں تو یہ آپ کے لیے نہایت آسان اور آپ کے معمولات میں زیادہ قابل توجہ بھی نہیں ہے لیکن اس جنبش کے لیے دماغ ہاتھ تک ہزاروں پیغامات ارسال کرتا ہے کہ فلاں پٹھے کو سکیڑ دیا جائے اور فلاں کو ڈھیلا کر دیا جائے۔ فلاں ڈوری کو سخت اور فلاں کو ڈھیلا چھوڑ دو۔

انسان اپنے اعضاء میں سب سے زیادہ ہاتھ استعمال کرتا ہے۔ ہاتھ انسان کا سب سے بڑا معاون ہے۔ اسی لیے کسی اہم معاون کے بارے میں کہتے ہیں فلاں میرا دست راست ہے۔

کہتے ہیں چالیس پینتالیس سال میں انسان اپنی انگلیاں کھولنے اور بند کرنے کا عمل کم سے کم پچیس کروڑ مرتبہ دھرا چکا ہوتا ہے۔ انسان کے دوسرے اعضاء تھک جاتے ہیں مگر ہاتھ نہیں تھکتے۔

ہاتھوں کی بناوٹ نہایت حیران کن ہے۔ انسانی جسم کے کسی دوسرے حصے میں مختصر سی جگہ میں اتنی زیادہ مشینری موجود نہیں ہے۔

ہاتھ کی کلائی میں آٹھ، ہاتھ کے پنجے میں پانچ اور انگلیوں کے جوڑوں میں چودہ ہڈیاں ہیں۔

ہاتھوں میں اعصاب کا گھمبیر نظام موجود ہے۔ چنانچہ ہر مربع انچ میں اعصاب کے ہزاروں سرے موجود ہیں۔ خصوصاً انگلیوں کے سروں میں تو اعصاب کا بڑا جال پھیلا ہوا ہے۔

ہاتھ ہمارا نہایت کارآمد خدمت گزار عضو ہے۔ اگر ہمارے ہاتھ کی چار انگلیاں ہوں اور انگوٹھا نہ ہو تو ہم کوئی کام نہیں کر سکتے۔ انگوٹھا نہایت قابل توجہ عضو ہے۔ اس کے نہ ہونے کی صورت میں چار انگلیوں سے چیزیں پکڑنے، گرفت میں لینے کا کام نہیں ہو سکتا۔ اگر انگوٹھا چار انگلیوں کے سامنے نہ ہوتا اور چار انگلیوں کی صف میں ہوتا تو بھی اس کی افادیت نہ ہوتی۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾[1]

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟ ہاں! (ضرور کریں گے) ہم تو اس کی انگلیوں کی پور بنانے پر بھی قادر ہیں۔

حیرت انگیز ہے کہ سب لوگوں کی انگلیوں کے نشانات یعنی لکیریں مختلف ہیں اور یہ نشانات کسی دوسرے شخص سے نہیں ملتے۔

پاؤں

پاؤں کی ساخت میں موجود ہڈیاں، پٹھے اور پٹیاں ہر لمحے دماغ کو پیغامات ارسال کرتی رہتی ہیں اور دماغ بھی ہر لمحے اپنے احکام جاری کرتا رہتا ہے۔ اس طرح یہ ڈیڑھ سو پونڈ وزنی اور پانچ سے چھ فٹ لمبے جسم کا توازن صرف سات، آٹھ انچ کی جگہ پر سنبھالے رکھتی ہیں کہ انسان سیدھا کھڑا رہ سکے۔ اگر آپ کو یہ کام آسان لگتا ہے تو اتنی وزنی اور لمبی چیز کو دو پیروں جتنی جگہ پر سیدھا کھڑا کر کے

[1] سورۃ القیامۃ: ۳۔۴

تجربہ کریں۔

انسان کھڑا رہتا ہے لیکن اسے کھڑا رکھنے کے لیے قدرت کی طرف سے کس قدر محیر العقول انتظامات فراہم ہوتے ہیں، ہم ان سے غافل ہیں۔

کھڑا ہونے کے لیے جسم کو توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس توانائی کا اندازہ کر کے پیر کا موصلاتی نظام دماغ کے مقررہ حصے کو اطلاع فراہم کرتا ہے۔ یہ حصہ دوسرے حصے کو ان ضروریات سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ حصہ خون میں ایک ہارمون شامل کر دیتا ہے جو گردن میں موجود توانائی کے مرکز کو موصول ہوتا ہے۔ گردن میں موجود توانائی مرکز ایک اور ہارمون خون میں شامل کرتا ہے جو چند سیکنڈ میں جسم کے سوٹریلین خلیوں تک پہنچتا ہے اور ہر خلیہ اپنے میں موجود ہزار توانائی گھروں کو آن کر دیتا ہے۔ پھر وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مطلوبہ توانائی پیروں کو فراہم کرتے ہیں۔سبحان اللہ مااعظم قدر تک۔

آپ صرف ارادہ کرتے ہیں آپ کے ارادوں کا نفاذ آپ کے جسم میں موجود کارندے کرتے ہیں۔ خدا نہ کرے کارندے مفلوج ہونے کی صورت میں آپ کا ارادہ دھرا رہ جاتا ہے۔

ناک

ظاہری طور پر تو ناک آپ کے حسن اور زیبائی کے لیے اہم ہے اور آپ کی عزت و وقار کے لیے بھی ناک کا استعارہ عام محاورہ ہے لیکن ناک کی دیگر خدمات نہایت قابل توجہ ہیں۔ ان میں سے ایک اہم خدمت نیند کے دوران انجام دیتی ہے۔

ہم نیند میں ایک کروٹ پر سوتے ہیں۔ اگر ناک ہمارا خیال نہ رکھے تو ہم ساری رات ایک ہی کروٹ پر سوتے رہتے، پورا جسم سن ہو جاتا اور صبح کسی کام کے قابل نہ رہتے۔

لیکن جب آپ ایک کروٹ پر دو گھنٹے تک سوئیں تو ناک کا بایاں نتھنا جسم کی بائیں سمت خون کی کمی محسوس کر کے مرکزی کنٹرولر کو اطلاع دیتا ہے۔ مرکزی کنٹرولر فوراً دماغ کے مخصوص حصے کو سگنل دیتا ہے۔سگنل ملتے ہی دماغ فوری ایکشن لیتا ہے اور متعلقہ پٹھوں کو ہدایت جاری کرتا ہے اور ہم بے خبر سوتے سوتے کروٹ بدل لیتے ہیں۔

نہایت قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کس قدر مہربان ہے کہ پہلو بدلنے کے لیے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کہیں اس لاڈلے کی نیند اور آرام میں خلل واقع نہ ہو اور نیند ہی کی حالت میں پہلو بدلنے کا اہتمام کیا۔سبحان الروف الرحیم۔

دوسری خدمت یہ ہے کہ جو غذا ہمارے شکم میں جاتی ہے اس کے لیے ناک چیک پوسٹ کا کام کرتی ہے۔معدے میں جانے والی غذا ناک چیک نہ کرتی تو ہم سڑی ہوئی متعفن غذا بے خبری میں کھا لیتے۔

پر لذت غذا کی خوشبو جیسے ہی ناک وصول کرتی ہے کام و دہن میں اس کھانے کے نگلنے اور ہاضمے کی معاون رطوبت (آب دہن) پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ آب دہن چند سیکنڈ میں ہمارے منہ، زبان، غذا کی پوری گزرگاہ اور معدے تک پھیل جاتا ہے۔

ناک کا عقبی حصہ نظام تنفس سے جڑا ہوا ہے اور درمیانی حصے سے دو برابر حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔یعنی دونوں نتھنوں کی طرف ناک کا حیرت انگیز مواصلاتی نظام تالو کے اوپر موجود ہے۔ اس غار نما علاقے کے اردگرد آٹھ مقامات پر مخصوص ہڈیاں موجود ہیں۔ یہ ہڈیاں اندر سے کھوکھلی ہیں۔ یہ ہماری آواز سنوارنے اور اس نمی کو حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں جس سے ہماری سانسیں مرطوب بنائی جاتی ہیں۔

پھیپھڑوں کو ہر وقت ۷۵ سے ۸۰ فیصد مرطوب اور ۹۰ ڈگری فارن ہائیٹ کی گرم ہوا درکار ہوتی ہے۔ اللہ کا یہ نظام کس قدر حیرت انگیز ہے کہ اس مختصر سی جگہ میں ہوا مطلوبہ درجے پر لانے کا کامل نظام موجود ہے۔خواہ آپ سرد ترین ہوا ناک سے اندر بھیجیں پھر بھی یہ چند اونس وزنی مشینری ایک سپر ائرکنڈیشن سے بہتر کام کرتی ہے۔

سانس کے ساتھ اگر جراثیم اندرونی حصوں میں پہنچ جائیں تو ان حصوں کو دماغ سے کھجلی کی ہدایت موصول ہوتی ہے۔ پھر اچانک پھیپھڑوں میں زیادہ ہوا بھر جاتی ہے اور یہ ہوا کئی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ناک کے حساس علاقوں سے گزرتی ہوئی باہر نکل جاتی ہے۔ اسے چھینک کہتے ہیں اور اسلام نے ہم سے کہا ہے کہ چھینک کے بعد الحمد للہ کہیں کیونکہ ان مضر جراثیم کو چھینک نے باہر نکال دیا ہے اوران مضر جراثیم کو چھینک کے ذریعے ہی باہر نکالا جا سکتا تھا۔

چھینک کے آداب یہ ہیں کہ آپ منہ پر رومال یا دونوں ہاتھ رکھیں تاکہ آپ سے نکلنے والے مضر جراثیم سے آپ کے ہم نشین محفوظ رہیں۔

دانت

انسان کے دانتوں کی الگ الگ ذمہ داریاں ہیں اور ان کی ذمہ داری کے تناسب سے انہیں توانائی اورطاقت کے وسائل و ذرائع عطا کیے گئے ہیں۔ یہ وسائل ان کی جڑوں میں موجود خون کی نالیاں

ہیں۔ چنانچہ سامنے کے دانتوں کے وسائل کم ہیں لیکن داڑھوں کی ذمہ داری سنگین ہے لہٰذا انہیں طاقت کے زیادہ وسائل دیے گئے ہیں۔

دانتوں کی ذمہ داری ہے کہ دہن میں آنے والا لقمہ چبا کر ریزہ ریزہ کریں تا کہ حلق سے گزرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

آب دہن

دانت غذا نرم کرتے ہیں اور آب دہن سے اس لقمے کو مکس کرنے کے لیے زبان چمچ کا کام کرتی ہے۔ اس طرح دانت، آب دہن اور زبان تینوں کے باہمی تعاون سے یہ لقمہ مناسب طریقے سے معدے میں اتر جاتا ہے۔

ہماری غذا گوارا اور قابل ہضم بنانے میں آب دہن کا بہت بڑا کردار ہے۔ سائنس دانوں نے بہت کوشش کی کہ آب دہن کی محیر العقول خاصیت پر مشتمل کوئی مادہ تیار کر سکیں لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

حلق

انسان جو غذا چبا کر حلق سے اتارنا چاہتا ہے ناک کے سوراخوں کے نیچے سے گزرتی ہے جہاں نتھنوں کے دو سوراخ ہیں۔ یہ جگہ نہایت خطرناک ہے۔ اگر اس وقت کھانا کھانے والا ہنس پڑے یا کوئی گفتگو کرے تو لقمہ سانس کی نالی میں پھنس سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس خطرے سے بچانے کا انتظام کر رکھا ہے۔

چنانچہ اس خطرناک جگہ پہنچتے ہی حلق میں موجود گوشت کا ٹکڑا اوپر جا کر ناک کے دونوں نتھنوں کو بند کر دیتا ہے۔ عین اسی وقت زبان پیچھے مڑ جاتی ہے اور انسان کا نوالہ گزر جاتا ہے۔ ۱۴۲

خطرہ ہنوز ٹلا نہیں ہے۔ اس نوالے کو معدے تک پہنچنے میں کئی خطرناک مرحلوں سے گزرنا ہے۔ چنانچہ نوالہ نگلتے وقت گردن پر ابھری ہوئی نرخرے کی ہڈی اوپر ہو کر سانس کی نالی کا وال بند کر دیتی ہے کہ کہیں یہ نوالہ سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔

غذا کی نالی میں بے شمار پٹھے ہیں۔ ان پٹھوں کی مدد سے اس میں ایسی حرکت پیدا ہوتی ہے جس سے غذا آہستگی سے معدے میں پہنچ جاتی ہے۔

معدہ

واضح رہے کہ معدہ غذا ہضم نہیں کرتا۔ ہضم کرنا آنتوں کا کام ہے۔ معدہ غذا قابل ہضم بناتا

ہے۔ معدے کی اندرونی سطح کھردری ہوتی ہے۔ اس سطح پر تقریباً تین کروڑ پچاس لاکھ غدود ہیں جو روزانہ تقریباً پون گیلن ایسی رطوبتیں پیدا کرتے ہیں جو غذا ہضم کرنے کے لیے بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

یہ تیزابی مادہ معدے میں اینزایم پیدا کرتا ہے جو پروٹین (گوشت) کو قابل ہضم بناتا ہے۔

معدے کی رطوبت تیزابی اثرات رکھتی ہے جو کھانا پیسٹ کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر یہ آہستہ سے اسے چھوٹی آنت کے منہ کی طرف بھیجتا ہے۔

یہاں تیزابی مادے زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں۔ اگر یہ زیادہ دیر تک اس جگہ رہیں تو چھوٹی آنت میں سوراخ کر سکتے ہیں۔ یہاں السر کی شکایت عام ہے۔ قدرت نے اسی لیے معدے میں یہ ہدایت ودیعت فرمائی ہے کہ معدہ غذا کے اجزاء تھوڑے تھوڑے کر کے چھوٹی آنت میں داخل کرتا رہے۔

چھوٹی آنت میں یہ شعور ہے کہ وہ یہ تیزابی مادے اپنی نمکیات کے ذریعے بے ضرر بنا دیتی ہے۔

چھوٹی آنت کا یہ شعور حیرت انگیز ہے کہ انسان اگر معمول سے زیادہ مرغن غذا کھائے تو چھوٹی آنت کو قبل از وقت پتہ چل جاتا ہے کہ معدے سے یہ مرغن غذا اس میں منتقل ہوگئی تو وہ اس کی تیزابیت تیزی سے بے ضرر نہیں بنا سکتی اور زیادہ دیر تیزابی مادے آنت میں رہ جائیں تو آنت زخمی ہوسکتی ہے۔ اس لیے آنت ایک قسم کا ہارمون خارج کرتی ہے۔ یہ کیمیائی سگنل معدے کی حرکات سست کر دیتا ہے۔

سوال: معدے میں گوشت وغیرہ ہضم ہوتا ہے۔ خود معدہ بھی تو ایک گوشت ہے۔ یہ کیوں ہضم نہیں ہوتا؟

جواب: معدے کے خالق نے معدے کی اندرونی جلد کو ایک خاص قسم کی حفاظتی تہ عطا فرمائی ہے۔ اگر یہ حفاظتی جھلی معدے پر نہ ہوتی تو یہ خود بھی ہضم ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

واضح رہے کہ انسان کے غم و غصے سے معدہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ غصے کی حالت میں بھوک بھی ختم ہو جاتی ہے چونکہ غصے کی وجہ سے نظام انہضام معطل ہو جاتا ہے۔

آنتیں

جیسا کہ ذکر ہوا ہماری غذا معدے میں نہیں بلکہ آنتوں میں ہضم ہوتی ہے۔ آنتیں ۲۶ فٹ لمبی ہوتی ہیں۔ یہ آنتیں حیرت انگیز کیمیائی عمل سے غذا گزار کر اس کے اجزاء خون میں شامل ہونے کے قابل بناتی ہیں جس سے ہمارے جسم کے لاکھوں ملین خلیوں کو رزق ملتا ہوتا ہے۔ یہی آنتیں جسم کے پٹھوں کو توانائی فراہم اور غذا کو نشاستے گلوکوز میں تبدیل کرتی ہیں۔

آنتوں کے چند حصے

پہلا حصہ: غذا جب آنتوں کے پہلے حصے میں پہنچتی ہے تو گاڑھے سوپ میں تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔

معدے سے آنے والی غذا تیزابی مادوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ جس کا یہ حصہ متحمل نہیں ہوتا۔ یہ تیزابی غذا زیادہ دیر اس حصے میں ٹھہری رہے تو آنت کے اندرونی حصے زخمی کر دیتی ہے جسے السر کہا جاتا ہے اور ساتھ غذا ہضم کرنے میں مدد دینے والی اینزائمز بھی کام بند کر دیتے ہیں۔

قدرت نے اس خطرے سے محفوظ رکھنے کا یہ انتظام فرمایا ہے کہ تیزابی مادے جونہی اس حصے میں داخل ہوتے ہیں آنت کا یہ حصہ خود کار نظام کے تحت ایک خاص قسم کی رطوبت پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہ رطوبت خون میں شامل ہو کر لبلبے تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ لبلبہ اس رطوبت میں موجود خفیہ پیغام پڑھ لیتا ہے اور فوری طور پر نمکین رطوبت پیدا کرنی شروع کر دیتا ہے۔ یہ رطوبت آنت کے اس حصے میں آ کر تیزاب کے مہلک اثرات ختم کر دیتی ہے۔ سبحان الخلاق العظیم۔

آنتوں کا اندرونی حصہ بھی قدرت کی عظیم نشانی ہے۔ اگر آپ اسے قدرتی آنکھوں سے دیکھیں تو یہ مخمل کی مانند لگتا ہے لیکن اگر خوردبین سے اس کا مشاہدہ کریں تو ایسا لگے گا جیسے آپ کسی شہر کا فضائی معائنہ کر رہے ہیں۔ اونچی عمارتیں اور جگہ جگہ راستے اور نشیب و فراز نظر آئیں گے۔ اگر آنت میں یہ ابھار اور گڑھے نہ ہوتے تو آنتوں میں غذائی اجزاء اسٹور کرنے کی مطلوبہ گنجائش نہ بنتی۔

ان میں انگلیوں جیسے ابھار جو کھربوں کی تعداد میں ہیں، انسان کو غذا فراہم کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ غذا سے زندگی بخش اجزاء اپنے میں جذب کر کے پورے جسم میں پہنچا دیتے ہیں۔

چھوٹی آنت چند گھنٹوں میں کھانا گاڑھے سیال میں تبدیل کر کے اسے بڑی آنت کے حوالے کر دیتی ہے۔ بڑی آنت کی کارکردگی بھی حیرت انگیز ہے۔ ہم اس کی تفصیل میں نہیں جاتے۔ سبحانك انّك علی کل شیء قدیر۔

ہمارے جسم کے بال

جدید سائنسی تحقیقات سے انکشاف ہوا ہے کہ ہمارے جسم کے بال سے درج ذیل معلومات حاصل ہو جاتی ہیں:

یہ بال کیا سر کا ہے؟ سر کے آگے سے ہے یا عقب سے؟ اطراف سے ہے یا وسط

سے؟

چہرے کا بال ہے یا ناک یا کان کا؟

اگر بدن سے متعلق ہے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ بال سینے کا ہے یا بغل کا یا پاؤں کا ہے۔

جس کا یہ بال ہے وہ کم سن ہے یا بالغ۔

مرد کا بال ہے یا عورت کا۔

بال نوچ کر جدا ہوا ہے، خود گرا ہے۔

کتنے وقت پہلے یہ بال گرا ہے۔ کتنے سال پہلے کا بال ہے۔

بال کا مالک مسموم ہوا تھا یا نہیں۔

رنگ قدرتی ہے یا مصنوعی۔[1]

جسم میں خون کی گردش

یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ آپ کے جسم میں دوڑنے والا خون، سرخ خلیوں سے عبارت ہے۔ ان سرخ خلیوں کی عمر ۱۲۰ دن ہوتی ہے۔ اس مختصر عرصے میں خون کا ہر خلیہ دل سے جسم اور جسم سے دل میں تقریباً ۷۵۰۰۰ مرتبہ گردش کر چکا ہوتا ہے۔

پلک جھپکنے میں خون کے تقریباً بارہ لاکھ خلیے مر جاتے ہیں اور اسی لمحے ہڈیوں کے گودے اتنے ہی سرخ خلیے تیار کر کے خون میں شامل کر دیتے ہیں۔

پلازما اور خون کے سرخ خلیے ایک منٹ میں جسم کے ہر حصے میں خون فراہم کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہیں جسم کی ۷۵ ہزار میل لمبی شریانیں عبور کرنا پڑتی ہیں۔

واضح رہے کہ جسم کی تمام شریانوں اور وریدوں کو ایک لائن میں رکھا جائے تو ان کی لمبائی اتنی ہوگی کہ اسے کرۂ ارض کے گرد تین مرتبہ لپیٹا جا سکتا ہے۔

دل پمپ کرنے سے خون رگوں میں دوڑتا اور جسم کے تمام چھوٹے بڑے اجزاء سیراب کرتا ہے۔ یہ خون ۲۵ ارب سرخ خلیوں پر مشتمل ہے جو جسم کے طول و عرض سے خطرناک فضلے یعنی کاربن ڈائی اکسائیڈ سمیت لیتے ہیں اور اسے جمع کر کے شریانوں سے نکل کر وریدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

[1] عجائب و مطالب

خون میں جسم کی ضرورت کے مطابق توانائی پیدا کرنے کا ایندھن، کولیسٹرول، نمکیات، اینزائمز یعنی خامرے اور چکنائی بھی موجود ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے کیمیائی مرکبات کے مختلف اجزاء الگ الگ خون میں ہوتے ہیں اور دماغ کی طرف سے حکم ملنے پر یہ اجزاء ایک لمحے میں مختلف مرکبات خون میں شامل کر دیتے ہیں۔

مثلاً زخم لگنے کی صورت میں یہ اجزاء مل کر ایک مرکب تیار کرتے ہیں۔ اس مرکب کے خون میں شامل ہوتے ہی خون میں جمنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح خون ضائع ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ اس مادے کی ضرورت ختم ہونے پر یہ اجزاء دوبارہ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

نہایت قابل توجہ ہے کہ ان اجزاء کو کون جمع کرتا، کون الگ الگ کرتا ہے؟ یہ کس کے حکم پر کیمیائی مرکبات تیار کرتے ہیں، ان کی مقدار کا تعین کون کرتا اور معیار کون کنٹرول کرتا ہے؟

کیا یہ حیرت انگیز مقاصد بغیر قصد کے از خود پورے ہوتے ہیں؟

ہم نے بار بار ذکر کیا ہے کہ کوئی مقصد بغیر قصد کے پورا نہیں ہوتا۔ اگر کبھی اتفاقاً ہوتا ہے تو وہ اتفاقی ہو گا، دائمی نہیں ہو گا۔ یہاں ہم ان مقاصد کا ذکر کر رہے ہیں جو دائمی ہیں۔ ایک قانون ہے جو بلاتعطل وقوع پذیر ہوتا ہے۔

جسم میں موجود کھربوں مخلوقات (خلیات) کو ان کی غذائی ضرورت ان کی دہلیز پر پہنچانا گردش خون کے ذمے ہے۔ خون کا یہ دوران دل کے پمپ کرنے سے شروع ہوتا ہے اور خون کی موٹی شیریانوں میں داخل ہو کر پتلی شریانوں کے ذریعے جسم کے تمام حصوں میں پہنچ جاتا ہے۔

قابل توجہ ہے کہ تازہ خون جسم میں گزرتے ہوئے آنتوں سے بھی گزرتا ہے۔ یہاں آنتوں کو ان کی غذائی ضرورت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ آنتوں میں موجود غذائی اجزاء اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔

گندا خون سارے جسم سے جمع ہو کر خون کی ایک مخصوص نالی کے ذریعے آنتوں سے براہ راست جگر میں داخل ہو جاتا ہے۔ خون آنتوں سے جگر میں پہنچتے ہی جگر اپنا کام شروع کرتا ہے۔ اگر یہ خون جگر سے گزرے بغیر براہ راست دل میں چلا جائے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

جگر سے یہ خون دل کے دائیں حصے میں آتا ہے۔ دل اس خون کو صفائی کے لیے پھیپھڑوں کی

طرف روانہ کر دیتا ہے۔

پھیپھڑے خون کے خلیوں میں موجود کاربن ڈائی آکسائڈ سانس کے ذریعہ خارج کرتے ہیں اور ان خلیوں میں تازہ آکسیجن بھر دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ صاف شدہ خون دل کے بائیں اوپری حصے میں آ جاتا ہے۔ وہاں سے دل کے نچلے حصے میں آتا ہے۔ یہاں سے دل پمپ کرتا ہے اور خون کے لاکھوں کروڑوں خلیے دوبارہ جسم کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ پیچیدہ عمل ہر منٹ میں ۷۲ مرتبہ انجام پاتا ہے۔

انسان کی زندگی اس مادے کے مرہون منت ہے جسے سرفیکٹنٹ (Surfactant) کہتے ہیں۔ پھیپھڑوں میں موجود ۳۰۰ ملین ننھی مُنی تھیلیوں کو اس مادے نے گھیر رکھا ہے۔ اسی مادے کی وجہ سے یہ ننھی تھیلیاں کھلتی اور سکڑتی ہیں۔

تعجب کا مقام یہ ہے کہ یہ مادہ بچے کی پیدائش سے ایک ماہ پہلے تیار ہوتا ہے اور پیدائش کے فوراً بعد کام کرنا شروع کرتا ہے۔

دل

''دل کی بات'' روزمرہ کے استعمال میں ایک محاورہ ہے اور اس سے مراد انسان کا مرکزی نقطہ ہے جس پر حیات قائم ہے۔

دل چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ پمپنگ مشین ہے جو چوبیس گھنٹے ہمارے جسم کو خون فراہم کرتی ہے۔ اس حصے کے بھی خانے ہیں۔ دائیں خانے کے بالائی حصے میں جسم کا تمام استعمال شدہ گندہ خون جمع ہوتا اور اسی سمت کے نچلے خانے میں چلا جاتا ہے۔ نچلا خانہ اس خون کو پھیپھڑوں کی طرف روانہ کرتا ہے۔ یہ خون پھیپھڑوں سے صاف ہو کر دل کے بالائی حصے میں آتا ہے۔ بائیں خانے کا زیرین حصہ خون کو دوبارہ انسان کے پورے جسم میں پمپ کرتا ہے۔ یہ عمل ایک منٹ میں اوسطاً ۷۲ مرتبہ، ایک گھنٹے میں ۴۳۲۰ مرتبہ اور ایک دن میں ۱۰۳۶۸۰ مرتبہ انجام پاتا ہے۔ اسے ایک سال، پھر پوری عمر سے ضرب دیں تو ایک حیران کن عدد سامنے آئے گا۔

حیران کن بات یہ ہے کہ دل ہر مرتبہ اس خون کو ستر ہزار میل لمبی نالیوں کے ذریعے پورے جسم میں پہنچاتا ہے۔ اگر ہم ستر ہزار کو ۷۲ سے، پھر اس سے حاصل عدد سے ضرب دیں تو ایک ناقابل شمار مسافت سامنے آتی ہے اور یہ بھی قابل توجہ ہے کہ پینتالیس سال کی عمر کے شخص کا دل تین لاکھ ٹن خون

پمپ کر چکا ہوتا ہے۔

نیند میں دل کو خون کم پمپ کرنا پڑتا ہے لیکن خوف، غصے، نفرت، حسد اور فکر مندی جو انسان کی صحت کے لیے شدید نقصان دہ ہیں، میں دل پر کئی گنا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ لہٰذا اگر انسان پرسکون رہے تو دل دیر تک بہتر کام کرتا ہے۔

کتاب ''بہ سوئے آفریدگار'' کے مطابق ہمارا دل ایک دن میں ۱۰۳۰۸۹ مرتبہ دھڑکتا ہے اور خون ہماری رگوں میں ۱۶۰ ملین میل فاصلہ طے کرتا ہے۔ اس دوران ہم ۲۳۰۴۰ مرتبہ سانس لیتے ہیں اور اس سانس کے ذریعہ ۴۳۸ فٹ مکعب ہوا صرف کرتے ہیں۔

دماغ

انسان اس کائنات کا عجوبہ اور اللہ تعالیٰ کا عظیم معجزہ ہے۔ چنانچہ انسانی تخلیق پر خود اللہ تعالیٰ کو ناز ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ [1]

بتحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ... [2]

اور اس نے تمہاری صورت بنائی تو بہترین صورت بنائی ...۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو دماغی صلاحیت عنایت کی ہے اس کے تحت انسان دماغ سے عبارت ہے۔ انسان کی حیات، صلاحیتیں، مہارتیں اور قابلیت، قوت گویائی، شنوائی اور بینائی وغیرہ سب انسان کے دماغ سے مربوط ہیں۔ دماغ ہی بولتا، سنتا، دیکھتا اور حرکت و جنبش کرتا ہے۔ ارادہ، فیصلہ کرنا اور قدم اٹھانا، یہ سب دماغ ہی سے مربوط ہیں۔

ہمارے دماغی سیلز کی تعداد اربوں میں ہے۔ ہمارا دماغ اردگرد کے ماحول سے روزانہ ملنے والی معلومات الگ الگ کر کے اپنے ہاں منتقل کرتا، مختلف خانوں میں محفوظ رکھتا اور ضرورت کے موقع پر ''یاد'' کے ذریعے انہیں حاضر کرتا ہے۔

دماغ کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمے داری بیرونی دنیا سے آکسیجن فراہم کرنا ہے۔

---

[1] سورۃ التین: ۴

[2] سورۃ التغابن: ۳

دماغ کے مخصوص اطلاعاتی مراکز دماغ کو اطلاع فراہم کرتے ہیں کہ خون میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تناسب بڑھ رہا ہے، خون کو تازہ آکسیجن کی ضرورت ہے۔ اس ایمرجنسی کال پر دماغ فوری ایکشن لیتا ہے اور متعلقہ غدود کی مدد سے پھیپھڑوں کے پھیلنے اور سکڑنے کی رفتار تیز تر کرنے پر سیٹ کر دیتا ہے۔ نتیجتاً ہم تیز تیز سانس لینے لگتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم دوڑتے ہیں تو آکسیجن تیزی سے خرچ ہوتی ہے اور ہمارا سانس تیز ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دماغ کو جسم میں بلند تر قلعے (کھوپڑی) میں جگہ دی ہے۔ کھوپڑی میں دماغ فوم جیسے ایک سیال مادے میں تیر رہا ہے جس کی وجہ سے دماغ جھٹکوں سے محفوظ رہتا ہے۔

دماغ کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اسے سیکورٹی کے سخت ترین حصار میں رکھا ہے۔ یہ سیکورٹی سسٹم صرف انہی اجزاء کو دماغ کے پاس آنے دیتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اجازت دے رکھی ہے۔ ان اجزاء کے علاوہ یہاں کسی اور کا داخلہ ممنوع بلکہ ناممکن ہے۔ سخت ترین حفاظتی انتظام کی وجہ سے دماغ کی ضرورت کا گلوکوز فراوانی سے آتا رہتا ہے جب کہ بکٹیریاز اور خون کے فاسد اجزاء دماغ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ البتہ شریعت کی ممنوعہ چیزوں کا دماغ پر بہت برا اثر ہوتا ہے جیسے شراب اور منشیات۔

دماغ تیس بلین خلیوں کا مجموعہ ہے۔ تعجب کا مقام ہے کہ دماغی سیل جسم کے باقی خلیوں کی طرح مرتے، بنتے نہیں ہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ جھوٹ کے بارے میں سائنسدانوں کا خیال تھا کہ دماغ سے جھوٹ کی تشخیص نہیں کر سکیں گے۔ آخرکار معلوم ہوا اس کی تشخیص ممکن ہے اور جھوٹ گھڑنے کا مقام پیشانی ہے۔ یعنی پیشانی کے پیچھے دماغ کے حصے میں جھوٹ گھڑا جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًۢا بِٱلنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَٰذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾ [1]

هرگز نہیں! اگر یہ شخص باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ وہ پیشانی جو جھوٹی، خطا کار ہے۔

اس آیت میں جھوٹ کی نسبت پیشانی کی طرف دی گئی ہے۔ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ گھڑنے کا مقام پیشانی ہے۔

امریکی جریدہ فوربز (Forbes) کے مطابق انسانی دماغ ایک ہزار کھرب معلومات کا ذخیرہ کر سکتا ہے۔

---

[1] سورة العلق: ١٥-١٦

لبلبہ۔ انسولین کا کارخانہ

لبلبہ انسانی جسم کے نظام کے لیے جو بنیادی کردار ادا کرتا اور محیر العقول مقاصد انجام دیتا ہے وہ بغیر قصد وارادے کے یوں ہی بلاوجہ صادر ہونا ممکن ہی نہیں ہیں۔

لبلبہ دوقسم کے ہارمون تیار کرتا ہے اور یہ ہارمون انسان کے خون میں شامل ہوکر آپ کی توانائی کی فراہمی میں مدد دیتے ہیں۔گلوکوز انسانی خلیوں کے لیے ایندھن کا کام کرتا ہے۔لبلبہ ایک ایسی حیران کن رطوبت (ہارمون) تیار کرتا ہے جوخون میں موجود گلوکوز کی مقدار مناسب سطح پر رکھتی ہے۔ یہ ہارمون انسولین کہلاتا ہے۔ انسولین اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ خلیوں کو ایندھن فراہم کیا گیا ہے اور خلیے اسے صحیح طریقے پر جلا رہے ہیں۔

لبلبہ کی اس عظیم خدمت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کا جسم انسولین پیدا نہیں کر رہا۔

غذا ہضم کرنے میں لبلبے کا اہم کردار ہے کیونکہ لبلبہ ہاضمے میں مدد دینے والی رطوبت تیار کرتا ہے۔

ہماری غذا معدے سے آنتوں میں پہنچتی ہے تو تیزابی اثرات سے بھرپور ہوتی ہے۔ یہ تیزاب معدے میں غذا ہضم کرنے کے لیے ضروری ہے تو یہ آنتوں کے اندرونی حصے کو سخت نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ اس نقصان سے بچانا قدرت نے لبلبہ کے ذمے کیا ہے۔ چنانچہ لبلبہ ایسی نمکین رطوبت تیار کرتا ہے جو آنتوں میں جا کر تیزابی اثرات ختم کر دیتی ہے۔

ان لوگوں کی عقل پر گریاں ہونا چاہیے جو کہتے ہیں بے شعور میں اس نقصان کا شعور آیا اور بغیر کسی شعور کے اس نے تیزابی اثرات ختم کیے اور بے مقصد آنتوں کو محفوظ کیا۔

باین عقل و دانست باید گریست

لبلبہ اگر انسولین پیدا نہ کرے تو انسان ذیابیطس کا مریض ہو جاتا ہے اور اس کے علاج کے لیے جانوروں سے انسولین لے کر انسان کے جسم میں داخل کی جاتی ہے۔

انسان کا جسم کھربوں خلیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر خلیہ ایک ہزار توانائی کے گھروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان سب کو ضرورت کا ایندھن فراہم کرنا لبلبے کے ذمے ہے۔

دو بنیادی اصول جن کے سب معترف ہیں:

۱۔ کائنات کی ہر چیز انسان اور دیگر موجودات کے موافق ہے۔

۲۔ ہر وہ چیز جو کوئی مقصد پورا کرے وہ اس کائنات میں قصداً وجود میں آئی ہے، نہ اتفاقاً۔

اپنے نفس پر حاکمیت

آپ نہیں کہہ سکتے کہ میں اپنے نفس پر حاکم ہوں۔ میرا نفس میرے ہاتھ میں ہے۔ میں جیسے چاہوں اسے چلا سکتا ہوں۔

کیونکہ آپ کا جسم اللہ کی ملکیت اور حاکمیت میں ہے، آپ کی نہیں۔

۱۔ دل کی دھڑکن: کیا یہ دھڑکن آپ کے ہاتھ میں ہے؟

آپ سو جاتے ہیں تو آپ کا کوئی ارادہ نافذ نہیں ہوتا، پھر بھی دل حرکت کر رہا ہوتا ہے۔

آپ جب آرام کرتے ہیں تو آپ کا دل آرام سے حرکت کرتا ہے لیکن جب آپ محنت کرتے ہیں تو آپ کا دل تیزی سے حرکت کرتا ہے تاکہ آپ کے جسم کو مطلوبہ خون فراہم ہو سکے۔

کیا یہ سب آپ کے حکم کے تحت ہے یا اللہ کے ارادے کے تحت؟

۲۔ تنفس: آپ سانس لیتے ہیں تو کیا اپنے ارادے سے؟ کیونکہ جب آپ سو رہے ہوتے ہیں تو آپ کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا پھر بھی آپ کا سانس لینے کا عمل جاری رہتا ہے جو آپ کے کسی ارادے کے تابع نہیں ہے۔

۳۔ قوت ہاضمہ: آپ کا معدہ جس حکیمانہ انداز سے آپ کی غذا ہضم کرتا ہے۔ ہضم کی ضرورت کے انزایم آپ فراہم کرتے اور مختلف جو ہضم میں مدد و معاون ہیں انہیں آپ ترشح کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ آپ کو علم ہی نہیں کہ معدے میں کیمیکلی کیا حیرت انگیز معجزے ہوتے ہیں۔

۴۔ آنتوں کی کارکردگی: آپ کی آنتوں میں غذا حرکت کرتی ہے اور جسم کے لیے مفید چیزیں جذب کر لیتی اور غیر مفید چیزیں باہر پھینک دیتی ہیں۔ کیا یہ حکمت آمیز کام آپ کرتے ہیں؟ آپ کو علم بھی نہیں ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

۵۔ دفاعی نظام: جسم میں موجود دفاعی نظام سے بھی آپ بے خبر ہیں۔

۶۔ جگر: آپ کا جگر آپ کے جسم کی ضروریات فراہم کرنے اور آپ کو زندہ سلامت رکھنے کے لیے پانچ سو (۵۰۰) خدمات انجام دیتا ہے۔ ان خدمات کی نہ صرف یہ کہ آپ کو خبر نہیں بلکہ آپ کو بتانے پر بھی آپ سمجھ نہیں سکیں گے۔

یہ سب آپ کے اختیار میں رکھ دیا ہوتا تو یہی نہیں کہ اپنی زندگی تھوڑی مدت کے لیے بھی

جاری رکھنا ناممکن ہوتا بلکہ آپ کی جو اختیاری حرکتیں اللہ کی طرف سے ہیں ان میں بھی آپ کا حصہ صرف ارادہ کرنا ہے۔ مثلاً آپ اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتے ہیں تو آپ صرف ارادہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد اٹھنے کے لیے آپ کے عضلات کیا خدمات انجام دیتے ہیں جن کی وجہ سے آپ اٹھ سکتے ہیں ان کا آپ کو پتہ نہیں ہے۔ اسی طرح آپ چلنا چاہتے ہیں تو چلنے میں آپ کے عضلات آپ کی کیا مدد کرتے ہیں، آپ ان سے بالکل بے خبر ہیں۔

اگر یہ تمام حرکات آپ کی طرف سے ہوتیں تو ان حرکات میں کام آنے والے تمام عضلات کی تمام خدمات سے آپ آگاہ ہوتے۔

اس سے معلوم ہوا یہ سب اللہ کی طرف سے آپ کے لیے مسخر ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ آپ کی حرکت کے کام آنے والی ہر چیز سے باخبر ہے۔

سائنس دانوں نے قدرتی دودھ کے عناصر کے مطابق مصنوعی دودھ بنانے کی کوشش کی اور قدرتی دودھ میں موجود عناصر اسی نسبت سے ملا کر دودھ بنایا۔ پھر بیس چوہوں میں سے دس کو قدرتی دودھ پلایا اور دوسرے دس کو مصنوعی دودھ پلایا۔ جن دس کو قدرتی دودھ پلایا تھا وہ پھل پھول گئے اور جن دس کو مصنوعی دودھ پلایا تھا وہ مر گئے۔

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ۔[1]

کیا کفار اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ یہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کر دیا ہے اور تمام جاندار چیزوں کو ہم نے پانی سے بنایا ہے تو کیا (پھر بھی) وہ ایمان نہیں لائیں گے؟

اس آیت کو سعودیہ میں ''اعجاز قرآن'' کانفرنس میں دنیا کے مشہور جیالوجسٹ ڈاکٹر الفرد کرومز کے سامنے پیش کیا گیا اور جب اس نے آیت کا مطلب سمجھ لیا تو چیخ اٹھا:

ناممکن! ناممکن! اس حقیقت کا ذکر چودہ سو سال قبل کسی کتاب میں کیا گیا ہو جب کہ اس حقیقت تک چند ہی سال پہلے ہم پہنچے ہیں اور انتہائی پیشرفتہ سائنسی وسائل استعمال کرنے اور طویل پیچیدہ ترین تحقیقات عمل میں لانے، خاص کر ایٹمی سائنس اور کائنات کی وحدت کے بارے میں تحقیقات کے بعد ہم اس حقیقت کو سمجھ سکے ہیں۔

[1] سورۃ الانبیاء: ۳۰

ممکن نہیں ہے کہ ایک بشر چودہ سو سال پہلے اس حقیقت تک پہنچ گیا ہو۔

حیوانات

حیوانات میں ان کی زندگی کے لوازمات، ہر قسم کا احساس اور سوجھ بوجھ موجود ہے۔ یہاں تک کہ بعض احساسات انسان سے بھی زیادہ ہیں۔

کچھ پرندے ایسے ہیں جو سردیوں میں گرم علاقوں کی طرف ہجرت کرتے ہیں اور ایک ہزار میل تک کی مسافت طے کرتے ہیں اور پھر واپس اپنے وطن لوٹ آتے ہیں۔ وہ راستہ گم نہیں کرتے۔

بعض حشرات جو نہایت چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں مائکروسکوپ کی طرح ہوتی ہیں اور بعض شاہینوں کی آنکھیں ٹیلی سکوپ ہوتی ہیں۔

انسان جن چیزوں کو بیس لاکھ گنا بڑا کرنے کے بعد دیکھ سکتا ہے بعض نہایت چھوٹے حشرات انہیں اپنی طبعی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔

انسان سونگھنے کی صلاحیت میں اضافہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔ کتوں میں سونگھنے کی صلاحیت انسان سے حیرت انگیز حد تک زیادہ ہے۔

مچھلی

مچھلی کی ایک قسم تخم ریزی کے لیے سمندر سے نکل کر دریا میں آتی ہے۔ دریاؤں میں انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں۔ دو سال تک دریاؤں میں زندگی گزارتے ہیں پھر سمندروں میں نکل جاتے ہیں۔ دو سال سمندر میں زندگی گزارتے ہیں پھر دوبارہ دریاؤں میں واپس آتے ہیں۔ اگر ان مچھلیوں کو پکڑ کر کسی دوسرے دریا میں ڈال دیا جائے پھر بھی یہ راستہ گم نہیں کرتیں۔ اپنے اصلی وطن دریا کی طرف لوٹ آتی ہیں۔

کس نے ان مچھلیوں میں اپنے وطن کی شناخت ودیعت کی ہے؟

مچھلیوں کی دوسری قسم

یہ مچھلیاں سانپ کی شکل کی ہوتی ہیں۔ بڑی ہو کر جس دریا میں ہوں، مثلاً مصر کے دریائے نیل میں ہوں یا امریکہ کے دریاؤں میں، انڈے دینے کے لیے بحر الکاہل کے گہرے سمندر کا رخ کرتی ہیں اور سمندر کی تہ میں انڈے دیتی ہیں جہاں ایک خاص تناسب کی گہرائی ہوتی ہے۔ انڈے دینے کے بعد یہ مچھلیاں مر جاتی ہیں مگر انڈوں سے نکلنے والی مچھلیاں جب بڑی ہو جاتی ہیں تو اپنی اپنی ماؤں کے بن

دیکھے وطن کا رخ کرتی ہیں اور تین سال کی مسافت طے کر کے اپنے مادری وطن پہنچ جاتی ہیں۔

یہاں ایک عرصے تک زندگی بسر کرنے کے بعد پھر گہرے سمندروں کا رخ کرتی ہیں اور وہاں جا کر انڈے دیتیں اور مر جاتی ہیں۔

ان مچھلیوں کو بن دیکھے وطن کا راستہ کس نے بتایا؟

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے۔ ایک خطبے میں آپ (ع) فرماتے ہیں:

ویعلم اختلاف النینان فی البحار الغامرات۔[1]

اللہ مچھلیوں کی گہرے سمندروں میں آمد و رفت کو جانتا ہے۔

پروانہ

مادہ ایک خفیف علامت کا اظہار کرتی ہے اور نر بہت دور سے ان علامتوں کو سمجھ لیتا اور جواب دیتا ہے۔ مادہ کے پاس کوئی ریڈار کی مانند آلہ نہیں ہے اور نہ نر کے پاس اسے کیچ کرنے کو کوئی ذریعہ ہے۔ مادہ اور نر کون سے ذرائع استعمال کرتے ہیں؟

شہد کی مکھی

شہد کی مکھی میں جو شعور اور مہارت اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہے وہ نہایت حیرت انگیز ہے اور جس جفاکشی سے انسان کو بہترین شفا مہیا کرتی ہیں نہایت فکر انگیز ہے۔

معطر پھولوں سے رس نکالنے کے لیے عموماً یہ مکھیاں اپنے چھتے سے ایک کلومیٹر سفر کرتی ہیں۔ کبھی سات سے آٹھ کلومیٹر پرواز کرتی ہیں۔

قابل توجہ ہے کہ ہر چار سو گرام شہد تیار کرنے کے لیے شہد کی مکھی اسی ہزار مرتبہ رفت و آمد کرتی ہے۔ اگر مکھی ہر مرتبہ صرف ایک کلومیٹر فاصلہ طے کرتی ہے تو یہ مسافت زمین کے گرد دو مرتبہ چکر لگانے کے برابر ہو جائے گی اور ہر مکھی اپنی زندگی میں ۱۳۵ گرام شہد تیار کرتی ہے۔

شہد کی مکھیاں اپنی ملکہ کے لیے شلہ ہا غذا تیار کرتی ہیں جو ملکہ کی طول عمر کے لیے مفید ہے۔ اسی وجہ سے ملکہ پانچ سال تک زندہ رہتی ہے۔ باقیوں کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ جو شہد ہم کھاتے ہیں ان میں بھی اس شلہ ہا غذا کا کچھ حصہ شامل ہوتا ہے جس سے شہد میں طول عمر کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ شہد میں میں کوئی جر ثومہ زندہ نہیں رہ سکتا اس لیے شہد طویل مدت تک خراب نہیں ہوتا۔ فراعنہ مصر کی قبروں

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۸

سے ۳۳ صدیوں پرانا شہد دریافت ہوا ہے جو طویل مدت کی وجہ سے سیاہ اور گاڑھا ہو گیا تھا لیکن اس میں کوئی عفونت نہیں آئی تھی۔

بار آوری

شہد کی افادیت بہت زیادہ ہے۔ ایک اہم افادیت یہ ہے کہ شہد کی مکھی جس نر پھول پر بیٹھتی ہے اس سے رس لے کر دوسرے پھول پر بیٹھتی ہے اور اس پر نر گل سے حاصل کردہ شیرہ جو نطفے کی مانند ہوتا ہے مادہ پھول پر پھیلا دیتی ہے جس سے وہ بار آور ہو جاتا اور پھل دیتا ہے۔ یہ کام اگرچہ دوسرے حشرات بھی انجام دیتے ہیں تاہم شہد کی مکھیوں کا کردار سب زیادہ اور اہم ہے۔

باغات کے مالک بعض اوقات اسی مقصد کے لیے اپنے باغ میں شہد کی مکھیوں کا چھتہ لگاتے ہیں تاکہ درخت خوب پھل دیں۔اس طرح ہم ان مکھیوں کے ذریعے شہد ہی نہیں مزیدار میوہ بھی کھاتے ہیں۔

دستہ بندی

شہد کی مکھیوں کے تین دستے ہوتے ہیں: ملکہ، مزدور اور نر۔

مزدور: ان مکھیوں کی ناک اور کان نہیں ہوتے۔ ان کی جگہ ان کے سروں پر دو شاخیں ہوتی ہیں جن پر موجود باریک بالوں سے سونگھنے اور سننے کا کام لیا جاتا ہے۔

مکھیوں کا چھتہ

یہ چھتہ ایک بے مثل کارخانہ ہے جہاں مکھیاں بلا وقفہ کام کرتی ہیں اور نہایت تنظیم اور تقسیم کار سے ہر دستہ اپنی ڈیوٹی نہایت ذمے داری سے انجام دیتا ہے۔

واضح رہے مکھیوں کی یہ جفاکشی اپنا پیٹ پالنے کے لیے نہیں ہوتی۔ ان کے اپنے لیے تو دو یا تین پھول ایک دن میں کافی ہوتے ہیں۔

ان کا ایک دستہ بیرونی ذمہ داریاں اٹھاتا ہے۔ پھولوں کا رس چوس کر چھتے میں لاتا ہے۔

ایک دستہ داخلی ذمے داریاں انجام دیتا ہے۔ انڈوں کی حفاظت کے علاوہ اپنے پروں کو ایک سیکنڈ میں چارسو مرتبہ ہلاتا ہے جن سے اٹھنے والی ہوا سے گرمی کے دنوں میں خنکی آ جاتی ہے اور سردی کے دنوں میں یہی پر اور یہی ہوا چھتے میں سردی نہیں آنے دیتی اور پروں سے نکلنے والی ہوا معتدل ہوتی ہے۔

ہم گرمی سے بچنے کے لیے کولر اور سردی سے بچنے کے لیے ہیٹر سے کام لیتے ہیں لیکن قدرت نے اس ناتواں پرندے کے پروں میں سردی اور گرمی سے بچنے کا نظام عنایت فرمایا ہے۔

پھلوں کا رس

شہد کی مکھیاں پھولوں کی جڑوں میں موجود شکر کا خاص مادہ بلکہ پھلوں کے ابتدائی مراحل کا جوہر چوستی ہیں۔

تعجب کا مقام ہے کہ ان کے چوسنے سے نہ صرف پھلوں پر منفی اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ پھل دار پودوں کی بار داری اور پھلوں کی پرورش میں اس قدر مفید ہے کہ ماہرین کہتے ہیں: اگر شہد کی مکھیاں ختم ہو جائیں تو لاتعداد پھل اور پھول نابود ہو جائیں۔

ملکہ کی سلطنت کا چشم کشا نظام

مکھیوں کا یہ حیرت انگیز نظام درج ذیل دستوں پر مشتمل ہے:

۱۔ دربان: یہ دستہ غیر متعلقہ فرد کو چھتے میں داخل ہونے نہیں دیتا۔ اگر کوئی مکھی گندگی پر بیٹھ گئی ہے تو دربان اسے چھتے کے باہر روک دیتے ہیں اور ملکہ کے حکم پر اسے سزائے موت دی جاتی ہے۔ ان مکھیوں کو اللہ تعالیٰ نے چھتے میں آنے والے مواد کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت عنایت کی ہے۔ انسان صرف بڑی بڑی لیبارٹریوں ایسا کر سکتے ہیں۔

۲۔ ایک دستہ انڈوں کی حفاظت پر مامور ہوتا ہے۔

۳۔ ایک دستہ بچوں کی تربیت کے لیے متعین ہوتا ہے۔

۴۔ ایک نہایت ماہر دستہ معماری پر متعین ہے جو مسدس شکل میں چھتہ بناتا ہے۔

۵۔ ایک دستے کی ذمہ داری ہے کہ نباتات پر جمے سفوف سے موم حاصل کر کے معماروں کو پہنچائے تاکہ چھتے کی تعمیر میں استعمال کیا جا سکے۔

۶۔ شہد بنانے پر مامور پھلوں، پھولوں سے رس چوسنے والے دستے کا آپس میں مواصلاتی نظام قائم ہے جس سے ہزاروں مکھیاں نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔

غذا کی تلاش میں نکلنے والی مکھی کو غذا کا ذخیرہ کہیں نظر آتا ہے تو چھتے میں واپس آتی ہے اور ایک خاص قسم کے رقص کے ذریعے دائرہ بناتی ہے۔ اس دائرے کو اس زاویے سے کاٹتی ہے جس سے دوسری مکھیوں کو پتہ چلتا ہے کہ غذا کس سمت اور کتنے فاصلے پر موجود ہے۔

یہ مکھیاں خوشبو دو میل دور سے سونگھ سکتی ہے۔

چھ ہزار عدسوں والی آنکھ

انسان کی آنکھوں میں صرف دو عدسے ہوتے ہیں لیکن شہد کی مکھی کی ہر آنکھ میں چھ ہزار عدسے

ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ بے شمار زاویوں سے باریک سے باریک جراثیم اور گرد وغبار بھی دیکھ سکتی ہے۔

ملکہ

شہد کی مکھیوں کی ملکہ جسامت میں دوسری مکھیوں سے بڑی ہوتی ہے اور ملکہ کے گرد حفاظتی دستہ ہوتا ہے جو ملکہ کے لیے غذا تیار کرتا ہے۔ جب تک ملکہ زندہ ہے مکھیوں کے نظام زندگی کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ اگر چھتے پر حملہ ہو جائے، چھتے کو خراب کیا جائے اور کافی تعداد میں مکھیاں ماردی جائیں اور ملکہ کے ساتھ قلیل تعداد میں مکھیاں بچ جائیں یہ باقی مکھیاں نہایت سرعت سے آپس میں تقسیم کار کر کے چھتہ از سر نو تعمیر کر کے تباہ شدہ نظام بحال کر دیتی ہیں۔

لیکن اگر ملکہ بھی مرجائے تو مکھیاں اس کے سرہانے حلقہ بنا کر سوگواری کی رسم ادا کرتی ہیں۔ پھر یہ مکھیاں کھانا ترک کر کے مرجاتی ہیں۔

اگر چھتے کی تباہی کے بعد ملکہ کو واپس کر دیا جائے تو باقی ماندہ مکھیاں ملکہ کے استقبال کے مراسم ادا کرتی ہیں اور راستے میں صف بستہ ہو کر ایک خاص قسم کی آواز نکالتی ہیں۔ شاید یہ ان کا قومی ترانہ ہے۔ نہایت احترام و احتشام سے اسے سلطنت کے ہیڈکوارٹر تک پہنچا دیتی ہیں اور اپنا نظام نئے سرے سے قائم کرتی ہیں۔

حیرت ہے کہ وہ اپنی ملکہ کا اس قدر احترام کرتی ہیں کہ ملکہ کو کبھی بھی پشت نہیں کرتیں اور اگر غذا کی کمی ہو جائے تو جو کچھ دستیاب ہے وہ ملکہ کو کھلاتی ہیں اور خود بھوک سے مرجاتی ہیں۔

جب ملکہ بوڑھی ہو جاتی ہے اور شاہی ذمہ داریاں انجام دینے کے قابل نہیں رہتی تو وہ سلطنت سے معزول ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ اس کی اولاد میں سے جو جوان اور رشید ہے نظام سلطنت سنبھال لیتی ہے۔ بوڑھی ملکہ ایک تاریک گوشے میں احترام سے ٹھہرائی جاتی، اس کی خدمت کی جاتی اور مرنے تک اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔

ملکہ کی ذمہ داری

ملکہ کا اپنی سلطنت میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کی ذمہ داری صرف مکھیوں کی نسل کا تسلسل قائم رکھنا ہے۔

چنانچہ ملکہ ان حجروں میں تخم گزاری کرتی ہے جو اس مقصد کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ملکہ روزانہ تین ہزار تک تخم گزاری کرتی ہے اور تخم گزاری کا موسم ختم ہونے تک ایک لاکھ انڈے دے چکی ہوتی ہے۔

ان انڈوں سے نکلنے والی مکھیاں تین دستوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایک دستہ شاہی خاندان کے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جس میں سے مستقبل میں کوئی ملکہ بن جائے گی۔

دوسرا دستہ نر مکھیوں پر مشتمل ہے۔

تیسرا دستہ مزدوروں کا ہے۔

الحاد کے محرکات

انیسویں صدی کے اواسط میں سائنس ابتدائی مراحل میں تھی اور سائنسدان اپنی تحقیقات بہت سادہ طریقوں سے آگے بڑھا رہے تھے۔ان کے ذریعے انہیں بہت سے حقائق نظر نہیں آتے تھے اور ستم ظریفی یہ رہی کہ ناقص معلومات کی بنا پر الحادی نظریات قائم کیے گئے جن سے ایک بہت بڑا طبقہ متاثر ہوا اور اس کے اثرات آج تک موجود ہیں۔

ناقص نظریات کی بنیاد اس سادہ بات پر رکھی گئی اور یہ سمجھا گیا:

''حیات اتفاقاً وجود میں آ گئی ہے۔''

یورپ میں جب تعلیم کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تو مذہب کے نا قابل قبول تصورات کے بارے میں شبہات شروع ہوئے۔ یہاں تعلیم کی روشنی آنے سے پہلے عام ناخواندہ اور غیر مہذب لوگ مذہب کے نام پر ہر قسم کی خرافات آنکھیں بند کر کے قبول کرتے رہے لیکن عقلوں کی بیداری کے بعد مذہبی تصورات پر سوالات اٹھنے لگے۔ ہم ذیل میں ان محرکات میں سے چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

پہلا سبب۔ اللہ کے بارے میں غلط تصور

عہد قدیم سفر تکوین اصحاح ۳ میں آیا ہے:

جب رب جنت میں چل رہا تھا آدم وحوا نے رب کی آواز سنی تو آدم وحوا جنت کے درختوں میں رب سے چھپ گئے۔ معبود رب نے پکارا: آدم تو کہاں ہے؟ آدم نے کہا: میں نے آپ کی آواز سنی تو میں ڈر گیا چونکہ میں عریاں (ننگا) تھا۔

ایسا رب جسے معلوم نہ ہو سکا آدم کہاں ہے!؟

سفر تکوین اصحاح ۳۲ میں اللہ تعالیٰ سے حضرت یعقوب کے کشتی لڑنے اور اللہ پر یعقوب کے غالب آنے کا ذکر ہے۔

مسیحیوں نے لوگوں کے گناہوں کے کفارے میں اللہ کا سولی چڑھنا مسلم قرار دیا ہے۔ اللہ کی نافرمانی ہو پھر اس نافرمانی کی سزا بھی معاذ اللہ، اللہ ہی کو بھگتنی پڑی۔ سب کے گناہوں کے کفارے میں

سولی چڑھ گیا۔

کیا مسیحیوں کا یہ مسلمہ عقیدہ قابل قبول ہے؟

باپ، بیٹا اور روح القدس تینوں، رب ہے۔

یہ تینوں ایک بھی ہے اور تین بھی۔

کیا ایک ذات بیک وقت ایک بھی ہو اور تین بھی ہو، ممکن ہے؟!

انجیل متی اصحاح ۲۶ میں یہ عبارت دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ کوئی انسان اپنے معبود کو کھا سکتا ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے، مسیحیوں میں یہ مسلم ہے:

جب وہ کھا رہے تھے تو مسیح نے روٹی لی اس میں برکت ڈالی اور اسے توڑا پھر فرمایا: یہ لے لو اور کھاؤ، یہ میرا جسم ہے۔ پھر پیالہ لیا دوسروں کو دیا اور فرمایا: تم سب اسے پیو، یہ میرا خون ہے۔

چنانچہ فکری بلوغ کے بعد تعلیم یافتہ لوگوں کو اس قسم کا مذہب قابل قبول نہیں تھا۔ چنانچہ بعض پادریوں نے بھی اس قسم کی خرافات کو رد کیا۔

دوسرا سبب۔ جہالت

دوسری وجہ یہ تھی کہ چرچ کی تعلیمات میں یہ مسلم مانا جاتا تھا کہ مظاہر طبیعت میں اللہ کا براہ راست دخل ہے۔ بارش خود اللہ برساتا ہے۔ زلزلہ خود اللہ زمین ہلا دیتا ہے وغیرہ۔ جب ان مظاہر طبیعت کے علل و اسباب کا پتہ چلا تو خدا کی قدرت ختم ہو گئی۔

تیسرا سبب۔ پرانے نظریات کا خرافات ہونا ثابت

الحاد کے محرکات میں سے ایک اہم محرک یہ بھی ہے کہ بہت سے قدیم نظریات سائنسی انکشافات کی روشنی میں غلط ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ دوسری صدی عیسوی میں قائم کردہ بطلیموسی فلکی نظریات تمام حلقوں میں مسلم رہے جن میں مانا گیا تھا کہ نظام شمسی میں زمین مرکز ہے۔ باقی سیارے زمین کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ آسمان کو عمارت کی چھت کی طرح تصور کرتے تھے اور آسمان کو ایک دوسرے کے اوپر پیاز کے چھلکوں کی طرح سمجھتے اور خیال کرتے تھے کہ سیارے اور ستارے اس چھت میں فانوس کی مانند آویزاں ہیں۔

جب جدید انکشافات کے ذریعے ان فرسودہ نظریات کی قلعی کھل گئی، ان باتوں کا ایک واہمہ ہونا

ثابت ہو گیا اور دیکھا کہ نظام شمسی کا مرکز زمین نہیں سورج ہے۔ سیارات فضا میں ہیں، کسی چھت کے ساتھ آویزاں نہیں ہیں، زمین سورج کے گرد گردش کر رہی ہے اور آخر میں نیوٹن سے جاذبہ و دافعہ کے قانون کا انکشاف ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ سب فضا میں معلق ہیں، کسی چھت کے ساتھ آویزاں نہیں ہیں۔

اس طرح پرانے نظریات کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی دکھائی دیں تو تمام پرانے نظریات پر بھی بہت اثر پڑا اور دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے۔ اس سے مذہبی نظریات مستثنیٰ نہیں تھے بلکہ مذہبی نظریات کو اسی تناظر میں جانچا جانے لگا اور ہر قدیم نظریہ زیر سوال آیا۔

چوتھا سبب۔ چرچ کی درندگی

مغرب میں دین کی بنیادیں ہلنے اور الحادی نظریات پیدا ہونے کے محرکات میں سے ایک اہم محرک چرچ کا سائنسدانوں کو درندگی کا نشانہ بنانا ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ چرچ نے بطلیموسی فرسودہ نظریات کو مسیحی تعلیمات شمار کر کے ان نظریات، دین کی مخالفت اور کفر قرار دیا۔

چنانچہ ۱۲۱۵ عیسوی میں پوپ سے ایک فرمان جاری ہوا جس کے مطابق یہ حکم دیا گیا کہ عقائد کی تفتیش کے لیے ایک محکمہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ ایک محکمہ بنام انگیز سیون قائم کیا گیا۔ یہ ظالمانہ محکمہ ایسے جرائم کا مرتکب ہوا جن کے ذکر سے آج بھی انسانی ضمیر لرز اٹھتا ہے اور جبین تاریخ پر ایک بدنما داغ ثبت ہوا ہے۔ کوئی نیا نظریہ قائم ہوتا اسے مسیحی تعلیمات سے انحراف تصور کر کے مرتد شمار کرتے اور سزائے موت دی جاتی۔

چنانچہ زمین کو گول سمجھنا کفر تھا۔ جراثیم کا اعتراف اللہ کے فیصلے کے خلاف گستاخی شمار ہوتی تھی چونکہ یہ بات بیماریاں اللہ کی طرف سے ہونے کے منافی ہے۔[1]

قانون علیت قبول کرنا کفر ہے چونکہ یہ قضا وقدر کے خلاف ہے۔ سنہ ۱۴۸۱ء سے ۱۴۹۹ء تک یعنی اٹھارہ سالوں میں کفر کا الزام لگا کر:

۱۔ ایک ہزار بیس افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔

۲۔ ۶۸۶۰ افراد کو چیر کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

[1] یہ تو بارہویں صدی کی مسیحی سوچ تھی ہماری بدقسمتی ہے کہ اکیسویں صدی میں مفتی محمد کفایۃ اللہ اپنی کتاب تعلیم الاسلام ص ۱۱۳ پر کفر وشرک کے بیان میں لکھتے ہیں: چیچک یا کسی اور بیماری کی چھوت کرنا اور یہ سمجھنا کہ ایک کی بیماری دوسرے کو لگ جاتی ہے اس میں شرک کی ملاوٹ ہے۔

۳۔ ۹۷۰۲۳ افراد کو اذیت دے کر مار دیا گیا۔
چرچ کی بالادستی کے سالوں میں پانچ ملین افراد کو موت کی سزا دی گئی۔[۱]
سائنسدان اومنس (Omanis) کو زندان میں ڈالا گیا اور وہ زندان میں ہی وفات پا گیا۔ پھر اس کی لاش اور کتب پر مقدمہ چلا کر انہیں جلا دینے کا حکم صادر ہوا۔
اس کا جرم یہ کہنا تھا:

قوس وقزح بندوں سے انتقام لینے کا اللہ کے ہاتھ میں کوئی اسلحہ نہیں ہے بلکہ پانی کے بخارات پر آفتاب کی تابش سے ہوا میں نمودار ہونے والا رنگ ہے۔

جب کہ ابن ہیثم نے صدیوں پہلے قوس وقزح کی اسی تشریح پر ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام قوس و قزح و الهاله رکھا گیا۔ اس میں مسئلہ نمبر ۱۴۶۹ صفحہ ۳۹۱ پر وہی بات کہی ہے لیکن کسی مسلمان نے اعتراض نہیں کیا۔

اٹلی کے سائنس دان گلیلو نے پندرہویں صدی میں زمین کا گول ہونا ثابت کیا تو چرچ نے اسے زندہ جلانے کی سزا سنائی۔ چنانچہ گلیلو نے اپنی جان بچانے کے لیے زمین گول ہونے کی تردید کر دی۔

گورڈانوبرونو (Giordano Bruno) کو روم کے کیتھولک چرچ کی انتظامیہ نے یہ کہنے پر آگ میں جلا دیا:

ستارے دور دراز پائے جانے والے سورج کی مانند اجسام ہیں۔ ان کے اپنے سیارے ہو سکتے ہیں۔ ان سیاروں پر زندگی پائی جا سکتی ہے۔[۲]

انسان کی رگوں میں خون کی گردش کا قائل ہونے پر ھاروے (Harvoy) کو سزا دی گئی۔ یہ سنہ ۱۵۷۹ء کا واقعہ ہے۔

جب کہ ۱۲۶۰ء میں اسلامی دانشور ابن النفیس بتا چکا تھا کہ انسانی رگوں میں خون گردش کرتا ہے۔[۳]

ان جرائم سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بیٹھ گیا کہ دین توہم پرستی سے عبارت ہے۔ سائنسی روشنی کے ابتدائی دنوں میں لوگ سائنس سے زیادہ مرعوب ہو گئے اور دین سے اتنے ہی دور ہو گئے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو الاسلام والحضارة العربية ۳:۵

[۲] قرآن مجید میں اس کی صراحت موجود ہے: وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ (سورة شوری: ۲۹) اور آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور وہ جاندار جو ان دونوں میں پھیلا رکھے ہیں اس کی نشانیوں میں سے ہیں اور وہ جب چاہے انہیں جمع کرنے پر خوب قادر ہے۔

[۳] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو Will Durant کی کتاب The Story of Civilization

چونکہ مشرقی اقوام زیادہ طفیلی سوچ رکھتی تھیں۔ ہر مغلوب تہذیب غالب آنے والی تہذیب کے زیر اثر چلی جاتی ہے اوراس وقت مغرب کے زیر اثر آ کر دین سے دور ہونا روشن خیالی شمار ہونے لگی۔

پانچواں سبب۔ سرمایہ دارانہ نظام

سرمایہ دارانہ نظام میں طبقاتی تفاوت اور امتیاز بہت زیادہ ہے۔ مراعات یافتہ طبقہ تمام مراعات لے جاتا اور کمزور وغریب طبقے کا استحصال ہوتا ہے۔ اس ظلم و استحصال کو چرچ اور علماء کی تائید حاصل ہوتی ہے اور دینی علماء بھی غریب متدین کے مقابلے میں امیر بے دین کو اہمیت دیتے ہیں تو لوگ دین سے بیزار ہو جاتے ہیں۔

چھٹا سبب۔ اقتصادی نظریات

سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں غیر سرمایہ دارانہ نظام کی ایک عالمی تحریک چلائی گئی۔ اس اقتصادی نظام کو مذہب کے خلاف منظم کیا گیا۔

اس نظام نے اعلان کیا کہ ہر شخص کو اپنی طاقت کے مطابق محنت کرنا ہو گی۔ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق مزدوری مل جایا کرے گی اور اعلان کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام مذہب اور دین والوں کا نظام ہے۔ اس کے مقابلے میں اشتراکی کمیونسٹ نظام دین کے خلاف ہے۔

ان کا یہ نظریہ عام ہونے لگا کہ کائنات صرف مادے سے عبارت ہے۔ خدا، روح، آخرت وغیرہ مذہب والوں کے خود ساختہ ہیں۔

دین سرمایہ داروں کی ایجاد ہے جو غریبوں پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ جنہیں یہ لوگ انبیاء کہتے ہیں وہ سب کے سب استحصالی اورعوام کو افیون پلانے آئے تھے۔

س اقتصادی نظریے نے غریبوں کی حمایت کا موقف اپنایا۔ اس لیے دنیا کے محروم طبقوں میں اس جدید نظریے کو پذیرائی ملی اور تاریخ کے اس بڑے دجال کا جادو کچھ دیر کے لیے چل گیا اور آج (۲۰۱۷ء) سے چند سال پہلے اس دجال کا چہرہ بے نقاب ہو گیا اور اس مزعومہ غریب پرور اقتصادی نظام کا بت پاش پاش ہو گیا۔ واضح رہے اس الحادی تحریک کا بانی کارل مارکس (Karl Marx) تھا جو یہودی تھا اور اپنے آپ کو عیسائی ظاہر کرتا تھا۔

ساتواں سبب۔ الحادی نظریات کی طاقت

ساتواں اہم سبب یہ رہا کہ الحادی نظریات رکھنے والے طاقت کے بھی مالک تھے۔ انہوں نے

طاقت کے بل بوتے پر اپنا نظریہ عام کرتے ہوئے معاشروں پر مسلط کیا اور کبھی یہ اثر انداز بھی ہوا۔

عام سطحی نظروں نے دیکھا کہ یورپ نے چرچ کے خلاف بغاوت کے بعد ترقی کی، الحادی نظریات کے بل بوتے پر روس سپر پاور بن گیا اور دینداری کا مظاہرہ کرنے والے ممالک ہر اعتبار سے پسماندہ اور الحادی قوتوں کی غلامی کر رہے ہیں۔

عوام سمجھتے ہیں کہ لوگوں نے دین سے دور ہو کر چاند کو مسخر کیا ہے اور ہم دین سے متمسک ہو کر اپنے آپ کو استقلال نہیں دے پاتے۔

آٹھواں سبب۔ یورپ کے مقابلے میں عالم اسلام کی شکست

یورپ نے اپنی ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر، خاص کر عالم اسلام اور عام طور پر تیسری دنیا کو اپنی مصنوعات کی مارکیٹ بنانے اور خام مواد ان ملکوں سے سستے داموں یا بغیر قیمت حاصل کرنے کے لیے عسکری قوت سے عالم اسلام پر یلغار کی اور عالم اسلام اپنی عسکری کمزوریوں کی وجہ سے یورپین کے حملے کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو گیا۔ اس سے عالم اسلام کے عوام کے عقائد متزلزل ہو گئے اور اس نے یورپی طرز زندگی اپنانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس طرح الحادی رجحانات عام ہو گئے۔

نواں سبب۔ جدید طرز زندگی

اس مادی جدید طرز زندگی میں عیش و نوش، آرام و آسائش اور شہوت پرستی کا مادر پدر آزاد ماحول ہے۔ دوسری طرف دین کی پابندیاں ہیں کہ یہ حرام، یہ ناجائز وغیرہ۔ لوگوں کی آزادی میں مداخلت کا تصور ہے۔

انسان مادی طور پر بے نیازی کے تصورات میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ انسان کو باغی بنا دیتے ہیں اور احتیاج کا احساس کمزور یا ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بندگی اللہ کی لامحدود قدرت پر ایمان لانے سے عبارت ہے اور بے احتیاجی کا تصور اللہ کی قدرت کے انکار کے مترادف ہے۔

دسواں سبب۔ رھبانیت

کتاب المفصل فی الرد علی حضارة الغربية سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

۱۹ ویں صدی عیسوی میں مادہ کو معبود قرار دیا گیا۔

ڈارون نے انسان کو حیوان قرار دیا۔ اگر آج انسان میں قدرت ہے تو کسی وقت روئے زمین پر بلی اور چوہے میں بھی قدرت تھی جو انسان کے آبا و اجداد ہیں۔

فرایڈ (Frued) نے تو انسان کی قیمت جنسی خواہشات قرار دیں اور اسے جنسی خواہشات کا بندہ قرار دیا۔

اس کے بعد کارل مارکس آیا تو اس نے اقتصاد کو انسان کا معبود قرار دیا۔

جب روم کی حکومت کو قدرت واقتدار حاصل ہوا تو روم اخلاق، پستی کی انتہائی گہری کھائی میں جا گرا اور زندگی کو صرف عیاشی بنا دیا گیا۔ ان کے دسترخوان پر برتن سونے اور چاندی کے ہوتے تھے اور گانے والی عریاں عورتوں کے ساتھ محفل جماتے تھے۔ اپنی طاقت وقوت کی پوجا کرتے اور طاقت کے زور پر دوسروں کی خون پسینے کی کمائی پر عیاشی کرتے تھے۔

جب روم نے عیسائی مذہب اختیار کیا تو بادشاہ قسطنطین (Constantine) نے وثنیت یعنی بت پرستی اور عیسائیت میں اتحاد قائم کرنے میں مصلحت جانی اور مذہب والوں نے بھی اس اتحاد کو قبول کیا۔ ان کا خیال تھا اس طرح کے اتحاد سے ملک زیادہ ترقی کرے گا۔

اس طرح عیسائی مذہب، روم کو بت پرستی کے دنوں کی کثافتوں اور نجاست سے پاک نہیں کر سکا۔ عیش ونوش کی غلاظتوں یا ترک دنیا کی خلاف فطرت رہبانیت میں افراط تفریط کا شکار ہو گیا اور انسانی زندگی کو جس اعتدال کی ضرورت ہے اس کے نزدیک بھی نہیں آسکا۔

رہبانیت، فطری رجحانات دبانے، طبعی قوتیں برباد کرنے اور زمین پر تعمیر و ترقی کے انسانی قدرتی حقوق پامال کرنے کا نام ہے۔

چنانچہ لیکی (lecky) اپنی کتاب تاریخ اخلاق اروپا یعنی یورپ کی اخلاقی تاریخ نامی کتاب میں لکھتے ہیں:

> رھبانوں کی تعداد میں ایک عظیم اضافہ ہوا اور انہیں اہمیت حاصل ہوئی۔ نظریں ان کی طرف مرکوز ہوئیں۔ ان کی تعداد کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں کہ کرسمس کی عید کے موقع پر ان کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی اور چوتھی صدی عیسوی میں ایک راھب پانچ ہزار راہبوں پر نگرانی کرتا تھا۔

لکھتے ہیں:

> راہب ماکاریوس (Macarius) چھ ماہ تک گندے نالے میں سوتا رہا تاکہ زہریلی مکھیاں اس کے ننگے جسم کو کاٹیں اور ایک بھاری وزنی لوہا اپنے جسم پر لادے

رکھتا تھا۔ اس کا ساتھی راہب یوسیبیس دو وزنی لوہے اٹھائے رکھتا تھا اور تین سال تک اس نے ایک کنویں میں زندگی گزاری اور راہب یوحنا (John) تین سال تک ایک پاؤں پر کھڑا رہا۔ اس مدت میں نہ بیٹھا، نہ سویا۔ جب تھک جاتا تو ایک چٹان پر ٹیک لگا لیتا۔ بعض راہب جسم پر کپڑے نہیں پہنتے تھے۔ اپنے بالوں سے جسم چھپاتے اور چوپاؤں کی طرف ہاتھوں اور پیروں پر چلتے تھے۔ ان میں سے اکثر درندوں کے غاروں، کنوؤں اور قبرستانوں میں زندگی بسر کرتے اور گھاس اور حشیش کھاتے تھے۔

حد تو یہ ہے کہ وہ جسمانی طہارت اور پاکیزگی کو روح کی پاکیزگی کے خلاف سمجھتے تھے اور اعضائے بدن دھونا جرم سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک زاہد ترین شخص وہ تھا جو کثیف ترین ہے۔

راہب اتھینس کہتے ہیں کہ راہب انتھونی نے اپنی پوری زندگی میں پاؤں دھونے کے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا۔

اور راہب ابراھام نے پچاس سال تک اپنے چہرے اور پاؤں کو پانی چھونے سے دور رکھا۔

راہب شہروں سے بچے اغوا کر کے انہیں راہب بناتے تھے۔ حتیٰ ماؤں کی گود سے بچے چھین لیتے اور رہبانیت کی تربیت دیتے تھے۔ یہاں تک مائیں اپنے بچے راہبوں سے چھپا لیتی تھیں۔

مسیحیوں کا ازدواج یعنی شادی کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ مرد اور عورت کا ازدواجی تعلقات قائم کرنا نجاست ہے خواہ شرعی عقد کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح مرد اور عورت کا فطری حق کی ادائیگی نجاست ہے اور اولاد پیدا کر کے نسل انسانی کو تحفظ دینا اس نظریے کے تحت جرم ثابت ہوتا ہے۔

اگر تمام مسیحی ان تعلیمات پر عمل کریں، ازدواجی نجاست میں ملوث ہونے اور اولاد پیدا کرنے کے جرم کے مرتکب نہ ہوں تو دنیا سے مسیحی نسل نابود ہو جائے۔ اگر مسیحی زندہ ہیں، ان کی نسلیں موجود ہیں تو رہبانیت کی خلاف ورزی کی بدولت ہیں۔ مغربی

دنیا ناجائز طور پر چرچ کے غیر فطری رواج سے آزاد ہو کر ایک اور بدترین غیر انسانی اور وحشی طرز زندگی میں جا گری ہے جس میں شرم و حیا کا ان کی ڈکشنری میں کوئی معنی نہیں رہا۔ چرچ کی طرف سے عائد غیر فطری پابندیوں سے آزاد ہو کر ایک اور غیر فطری کھائی میں ایسے گری ہے جس کا ذکر کرنا ایک شرم آشنا انسان اور لکھنے والے کے قلم کو زیب نہیں دیتا۔

الحاد کے اثرات

۱۔ بے چینی، بے سکونی۔

۲۔ ذاتی، شخصی مفاد پرستی: ایمان سے خالی شخص اپنے ذاتی مفادات کے علاوہ اقدار کا مالک نہیں ہوتا، نہ ہی انسانی اقدار کا مالک ہونے کے رجحانات اس میں پائے جاتے ہیں۔ وہ دوسروں کے بارے میں کیوں سوچے؟ دوسروں سے ہمدردی کرنے میں نہ اس کا ذاتی مفاد ہے نہ ہی کسی اور مفاد کا یہ قائل ہے۔ ملحد میں دوسروں سے نیکی کرنے کا کوئی محرک نہیں ہوتا۔ البتہ ایک فطری محرک اس میں ہونا چاہیے لیکن الحادی تربیت و طرز فکر نے اس فطری رجحان کو بھی اس سے چھین لیا۔ وہ صرف دوسروں کا استحصال کرنے کا سوچ سکتا ہے۔

چنانچہ مغربی دنیا کی خونخواری اور تیسری دنیا خصوصاً عالم اسلام کو خاک و خون میں نہلانا کس سے پوشیدہ ہے۔

۳۔ جرائم پیشہ: ایمان سے خالی معاشروں میں جرائم سے رکنے کا کوئی محرک نہیں ہے۔ اس لیے مغربی ملکوں میں جرائم سے روکنے کے لیے مضبوط نظام نافذ کرنے کی ضرورت پیش آئی کیونکہ نظام کی وجہ سے رکاوٹ نہ ہونے کی صورت میں مغربی انسان کا اپنا کوئی ضمیر اور وجدان نہیں ہوتا۔

چنانچہ سنہ ۱۹۷۷ء میں نیویارک میں بجلی منقطع ہونے کا نتیجہ مشہور ہے۔ صبح پتہ چلا کہ رات بجلی جانے کی وجہ سے تاریکی میں ہزاروں تجارتی مراکز، سٹورز اور مکانات لوٹ لیے گئے۔ قابل توجہ یہ ہے کہ اس لوٹ مار میں تمام طبقات، تمام افراد شامل تھے۔ حتیٰ کہ پولیس بھی اس لوٹ مار میں شریک تھی۔

ماہرین نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر ایک ہفتہ بجلی بند رہ جاتی تو نیویارک مکمل طور پر تباہ ہو جاتا۔

مغربی تمدن

مغربی تمدن میں ثقافتی و تعلیمی سرگرمیاں صرف مادیات میں منحصر ہیں۔ انسان کے انسانی پہلو کو

سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔صرف انسان کی مادی ساخت و بافت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

تجرباتی علوم نے انسان کے حیوانی پہلو کو سیراب کیا ہے اور روحانی پہلو کو تشنہ چھوڑا ہے۔

مادی پہلو سیراب کرنے کی کوشش لا حاصل ہے کیونکہ انسان اگر روحانی قدروں کا مالک نہ ہو اور اس کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت اور وسائل عیش ونوش آجائیں تو انسان میں پوشیدہ خواہشات کا درندہ بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ درندہ اپنے خطرناک سینگ، پنجے اور دانت نکالنا شروع کرتا ہے۔ پھر وہ کسی کے قابو میں نہیں آتا اور پریشان حال رہتا ہے۔سکون چھن جاتا ہے۔ نیند حرام ہو جاتی ہے۔ کام و دہن کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے اور مختلف بیماریوں کا شکار ہونے کی وجہ سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

روایت کے مطابق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ قسمت ساز فرمان کس قدر سبق آموز ہے اور اس میں انسان ساز زندگی کا سلیقہ ہے۔ هشام سے فرمایا:

ان کان مایکفیك یغنیك فادنی ما فیها یغنیك وان کان ما یکفیك لا یغنیك فکل مافیهالا یغنیك ۔[1]

اگر تیری کفایت کی چیز تجھے بے نیاز کرتی ہے تو کمترین چیز تجھے بے نیاز کر دے گی اگر تیری کفایت کی چیز تجھے بے نیاز نہیں کرتی تو دنیا کی کوئی چیز تجھے بے نیاز نہیں کرسکتی۔

لیو بولڈ فائس جس نے اسلام قبول کیا اور اپنا نام محمد اسد رکھا، اپنی کتاب الاسلام علی مفترق الطرق میں لکھتے ہیں:

جدید مغربی دنیا نے اپنی کوششوں سے سائنسی فوائد حاصل کیے۔ ان کا مقصد زندگی کے اسرار و رموز کا انکشاف تھا... لیکن زندگی کسے کہتے ہیں، اس کا مقصد و منزل کیا ہے؟ یہ یورپ والوں سے پوشیدہ رہا اور وہ اس کی اہمیت کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔[2]

المفصل کے مؤلف امریکہ میں اپنے چشم دید حالات میں لکھتے ہیں:

امریکی، دین کی روح، احترام و تقدس سے زیادہ کسی اور چیز سے دور نہیں ہیں۔ اگر چرچ عبادت کی جگہ ہے تو امریکی چرچ میں سوائے عبادت کے باقی سب کچھ ہوتا ہے۔ یعنی جتنی کثافتیں اور فحاشیاں دوسری جگہ ہوتی ہیں وہ چرچ میں بھی ہوتی ہیں۔

[1] الکافی ۲: ۱۳۹ باب ذم الدنیا...

[2] المفصل

کتاب اسلام و سیمای تمدن غرب کے مؤلف لکھتے ہیں:
مجھے ھیمبرگ (Hamburg) میں ایک یہودی چرچ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں عمارت دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہمیں ایک خصوصی ہال دکھایا گیا جو شراب نوشی کے لیے مخصوص تھا۔

حقائق کا مسخ

آج کل کے دنیا پرست ایسی باتوں کو تمدن کا حصہ قرار دیتے ہیں جو ننگ و رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں ہے:

۱۔ بے لگامی اور نازیبا حرکتوں کو ''آزادی''،
۲۔ خواتین کی عریانی اور بے حیائی کو ''تمدن''
۳۔ مقابلہ حسن کو ''شخصیت''،
۴۔ ہرگونہ فساد میں غرق ہونے کو ''حریت''،
۵۔ بے گناہ لوگوں کے قتل و غارت کو ''طاقت وقوت''،
۶۔ تخریب کاری اور دیگر اقوام کے استحصال کو ''آبادی کاری وتعمیر''
۷۔ اخلاق سوز کردار کو ''خواہشات کا احترام''،
۸۔ محروم لوگوں کے حقوق پامال کرنے کو ''انسانی حقوق''
۹۔ بری عادت کی اسیری اور عار و ننگ کی ہوس پرستی کو ''آزادی، احترم وانتخاب''،
۱۰۔ دھوکہ و فریب کے ذریعے دوسروں کی دولت پر ڈاکہ ڈالنے کو ''قابلیت و لیاقت''،
۱۱۔ عدل و انصاف کی پابندی اور دوسروں کے حقوق کا احترام رکھنے کو ''نالائق''،
۱۲۔ خدا پرستی اور اطاعت خدا کو ''قدامت پرستی''،
۱۳۔ جھوٹ، عہد شکنی دو رخی کو ''سیاست''،

اور

۱۴۔ بے دینی کو ''روشن خیالی'' کہتے ہیں۔[1]

صدر کلنٹن نے ایک بار کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

[1]عجائب و مطالب

ہمارا ملک دنیا کا طاقتور، امیر ترین اورنہایت خوبصورت ہے مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم جرائم میں دنیا میں پہلے نمبر پر ہیں۔

مؤلف المفصل فی ردالحضارۃالغربیۃ لکھتے ہیں:

ایک تنظیم کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق سالانہ تین لاکھ عورتیں یورپ میں جسم فروشی کے لیے داخل ہوتی ہیں۔

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق یورپ میں روزانہ ۷۵ ہزار برازیلی عورتیں جسم فروشی کرتی ہیں۔

برطانیہ کے ایک مجلہ کے مطابق برطانیہ میں ہر پانچ افراد میں سے ایک فرد کسی کے (ناجائز) بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر پالتا ہے۔

CNN کی ایک رپورٹ کے مطابق یورپ کے غریب ملکوں، مشرقی یورپ اور روس سے مغربی یورپ کے لوگوں کو سالانہ بیس لاکھ عورتیں اور بچیاں جسم فروشی کے لیے فروخت ہوتی ہیں اور پندرہ ہزار سے زیادہ عورتیں اسی شرمناک مقصد کے لیے امریکہ بھیجی جاتی ہیں۔ ان میں اکثریت کا تعلق میکسیکو (Mexico) سے ہوتا ہے اور جسم فروشی کے لیے مشرقی ایشیا سے آنے والی عورتیں سولہ ہزار ڈالر میں فروخت ہوتی ہیں۔

مغرب میں نکاح کے بغیر زنا کاری بہت آسان ہے اور نکاح کے بعد جائز ازدواجی تعلق بہت مشکل ہے۔ تاریخ انسان میں ایسی ذلیل ترین تہذیب وجود میں نہیں آئی۔

یونیسکو (UNESCO) کے شعبہ خواتین کی ایک رپورٹ، جو سنہ ۲۰۰۶ء کی کانفرنس میں پیش کی گئی تھی، میں آیا ہے کہ گزشتہ اکتیس سالوں میں چالیس ملین عورتیں جسم فروشی کے مراکز میں فروخت کی گئی ہیں۔[1]

اٹلی کی پولیس رپورٹ کے مطابق اٹلی میں روزانہ سات ہزار (۷۰۰۰) جرائم سرزد ہوتے ہیں۔

ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ۱۴ سے ۲۰ سالہ ستر (۷۰) فیصد لڑکیاں بے پدر اطفال پالنے پر مجبور ہیں۔ امریکہ میں یہ پریشانی ہے کہ اس کا کیا حل ہوسکتا ہے۔ والدین اور تعلیمی ادارے اس کا حل تلاش کر رہے ہیں اور سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ اسلام کی تعلیم، اخلاقیات ان اداروں میں پڑھائی

---

[1] عجائب و مطالب ص ۲۵۵

جائیں تا کہ معاشرے کی اخلاقیات سدھر سکیں۔[1]

مؤلف کتاب المفصل فی الرد علی حضارۃ الغرب لکھتے ہیں:

ایک امریکی لڑکی نے امریکہ کی اجتماعی زندگی کے بارے میں گفتگو کے اثنا میں مجھ سے کہا:

جنسی تعلقات ایک خالص بیالوجیکل (Biological) مسئلہ ہے۔ تم مشرقی لوگ اس سادہ مسئلے میں اخلاقی عنصر داخل کر کے اسے پیچیدہ بناتے ہو۔ دیکھیے گھوڑے، بیل، گائے، بکری، بھیڑ، مرغا وغیرہ کسی اخلاقی پابندی کے بغیر جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی زندگی آسان ہے۔

جرمن ذرائع ابلاغ میں ایک لڑکی کا ذکر آتا رہا جس نے اعلان کیا تھا کہ میں ایک ہزار مردوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے سے پہلے اخبارت کو انٹرویو نہیں دوں گی۔

واضح رہے مغربی دنیا میں مرد و زن کا جنسی تعلق قائم کرنا، خواہ اجنبی ہو یا شوہر والی، اگر دونوں کی رضامندی سے ہو تو ناجائز تصور نہیں ہوتا۔

کسی خاتون کے چھ سات اجنبی مرد فرینڈز نہ ہوں تو عیب شمار ہوتا ہے۔ ان تمام جنسی بے راہرویوں اور آزادیوں کے باوجود مغرب والوں کی جنسی خواہشات پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتیں۔

مغربی تمدن کے بارے میں ڈاکٹر الیکسس کاریل (Dr. Alexis Carrel) نے یہ تبصرہ کیا ہے:

عصر حاضر کا تمدن ایک مشکل صورت حال سے دوچار ہے۔ یہ تمدن ہم سے سازگار نہیں ہے کیونکہ یہ ہماری حقیقی طبیعت کی شناخت کے بغیر قائم کیا گیا ہے۔ یہ تمدن سائنسی انکشافات سے پیدا ہونے والے خیالات، لوگوں کی خواہشات، ان کے اوہام، نظریات اور رغبتوں کی پیداوار ہے۔ اگرچہ یہ تمدن ہماری کاوشوں سے وجود میں آیا ہے لیکن یہ ہماری ظرفیت، اجتماعی شکل وصورت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

کسی مغربی مفکر نے کہا ہے:

مغرب معنویات میں مشرق کا محتاج ہے۔ مشرق معنویات، روحانیات میں مغرب سے بہت آگے ہے۔

---

[1] عجائب و مطالب

مشہور ماہر سوروکن (Sorokin) کہتے ہیں:

مغرب میں زندگی کے اہم پہلو اور تمدن غیر معمولی بحران کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس تمدن کے جسم و جان دونوں سخت بیمار ہیں۔ مغربی تمدن کے جسم یا اعصاب میں بہتر کام کرنے والے کسی حصے کا موجود ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔[1]

مغرب میں آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے وجود میں آزاد ہے۔ دوسرے کی زندگی میں مداخلت کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ شوہر بیوی کی آزادی میں، باپ بیٹی کی آزادی میں دخل نہیں دے سکتا۔

مغرب کا انسان

سنہ ۱۹۶۰ء میں ایک سو پچیس ملین ٹن گندم امریکہ کے سٹوریج میں سڑا کر خراب کی گئی تاکہ گندم کا نرخ محفوظ رہے اور لاکھوں ٹن گندم سمندر برد کی گئی تاکہ اس کی قیمت برقرار رہے۔

برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) کہتے ہیں:

گزشتہ چودہ سالوں میں چار ارب ڈالر کی خوراک امریکہ نے قیمتیں مستحکم رکھنے کے لیے ضائع کی۔

مغربی تمدن میں زندگی سے مایوسی

خودکشی کا روز افزوں رجحان[2]

مغرب میں زندگی سے مایوس معاشروں میں خودکشی کے رجحانات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس موضوع پر ادریس کنبوری **کی تحریر کا خلاصہ۔**

مغرب کی یاس، پریشانی اور بے سکون زندگی کی ایک علامت خودکشی کا رجحان ہے جس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور اس نے یورپ کے تمام ملکوں کو اپنے لپیٹ میں لے لیا ہے۔

چنانچہ ڈنمارک، آسٹریا اور فن لینڈ کے بعد سب سے زیادہ خودکشی کے واقعات فرانس میں ہو رہے ہیں۔ چنانچہ فرانس میں ہر روز ۴۰۰ افراد اقدام خودکشی کرتے ہیں اور سنہ ۱۹۹۰ء کے بعد خودکشی کے واقعات میں ساڑھے تین گنا اضافہ ہوا ہے جن میں ۲۵ اور ۳۴ سالہ نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہے۔

[1] اسلام و سیمای تمدن غرب
[2] از کتاب المفصل فی رد الحضارة الغربية۔ ادریس کنبوری

جرمن میں سنہ ۱۹۹۵ء میں ۱۲۸۸۸ لوگوں نے اقدام خودکشی کیا۔مغربی ممالک میں اس آفت کے ذریعے لوگوں کی زندگی کا خاتمہ عام ہونے لگا ہے۔

عالمی ادارۂ صحت نے ایک سو پانچ (۱۰۵) ملکوں کی رپورٹ پیش کی جس میں کہا ہے:

سنہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۵ء میں خودکشی میں ساٹھ فیصد اضافہ ہوا ہے۔

کہتے ہیں خودکشی سے مرنے والوں کی تعداد جھگڑوں اور ٹریفک حادثات میں مرنے والوں سے زیادہ ہے۔

چند سالوں میں روس میں ۵۲۵۰۰، امریکہ میں ۳۱۰۰۰، جرمن میں ۱۲۵۰۰ اور فرانس میں ۱۱۶۰۰ افراد نے خودکشی کی۔

مغربی معاشرے میں خودکشی کے اسباب میں سب سے بڑا سبب خاندانی زندگی کا فقدان اور تنہائی کی وجہ سے زندہ رہنا ناگوار ہو جانا ہے۔

چنانچہ سویڈن میں چالیس فیصد اور برطانیہ میں سات ملین افراد تنہا رہتے ہیں۔

سنہ ۲۰۱۰ء کی ایک رپورٹ میں آیا ہے کہ برطانیہ کی کل آبادی میں تنہا رہنے والوں کی تعداد خاندان یا ساتھیوں کے ساتھ رہنے والوں سے زیادہ ہے اور لندن کے ترقی یافتہ علاقوں میں نصف سے زیادہ مکانوں میں تنہا افراد رہتے ہیں۔

تعجب کا مقام ہے کہ کچھ لوگوں نے خودکشی کو ایک نظریہ بنا لیا اور اجتماعی خودکشی کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔

کتاب اسلام اور سائنس صفحہ ۶۳ میں ہے:

خودکشی کی جتنی وارداتیں گزشتہ دس سالوں میں ہوئی ہیں پوری تاریخ ان وارداتوں سے خالی ہے۔ اس جدید انسان نے فاسفورس بم ایجاد کیا جس کی آگ پانی سے بھی نہیں بجھتی۔ اس انسان نے حیاتیاتی جرثوموں پر مبنی ہتھیاروں، جوہری بموں اور بے شمار قسم کے اسلحہ کے ذخائر بڑی تعداد میں جمع کیے ہیں کہ ان ذخائر سے موجودہ دنیا کو سینکڑوں مرتبہ تباہ و برباد کیا جا سکتا ہے۔

اسی کتاب میں ''جدید تہذیب تاریخ کی سفاک ترین تہذیب'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

یہ وہ انسان ہے جس نے تین سو سالوں میں ایک ارب پچھتر کروڑ انسانوں کو قتل کیا۔

ازواج و طلاق

سنہ ۱۹۹۶ء میں شادی کے بعد طلاق کی شرح سویڈن میں ۶۴ فیصد، امریکہ میں ۴۹ فیصد، بیلجیم میں ۵۶ فیصد، برطانیہ میں ۵۳ فیصد، روس میں ۵۶ فیصد اور ترکی میں ۶ فیصد تھی۔

مغربی ثقافت نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں صرف عالم مادیات میں منحصر رکھیں، انسان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر کی ہے تو صرف انسان کے مادی پہلو سے۔

تجرباتی علوم نہ ہونے سے مادی خسارہ آسان ہے اور انسانی علوم نہ ہونے سے روحانی خسارہ نا قابل تلافی ہے۔

جدید تمدن اور کرۂ ارض کا المیہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔[1]

لوگوں کے اپنے اعمال کے باعث خشکی اور سمندر میں فساد برپا ہو گیا تا کہ انہیں ان کے بعض اعمال کا ذائقہ چکھایا جائے، شاید یہ لوگ باز آ جائیں۔

کرۂ ارض زندگی کے لیے سازگار ہونے کے بعد عصر حاضر کا انسان اپنے ہاتھوں اسے ایک المیہ کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ المیہ کرۂ ارض کا ماحول ہے۔

بعض دانشور کہتے ہیں:

افریقہ کے غیر مہذب اور جدید تمدن سے دور لوگ زیادہ عیش و آرام میں ہیں بہ نسبت امریکہ کے رہنے والوں کے۔ کرۂ ارض نا قابل تلافی اور مہلک اثرات کی زد میں ہے۔

اس پر قرآن کی یہ آیت صادق آتی ہے:

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○[2]

پھر جب زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہو گئی اور زمین کے مالک یہ خیال کرنے

---

[1] سورة الروم: ۴۱
[2] سورة يونس: ۲۴

لگے کہ اب وہ اس پر قابو پا چکے ہیں تو (ناگہاں) رات کے وقت یا دن کے وقت اس پر ہمارا حکم آ پڑا تو ہم نے اسے کاٹ کر ایسا صاف کر ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ بھی موجود نہ تھا، غور وفکر سے کام لینے والوں کے لیے ہم اپنی نشانیاں اس طرح کھول کر بیان کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں امریکہ کے سابق نائب صدر الگور **(Al Gore)** نے ایک تحقیقی جائزہ لیا ہے اور اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا عربی میں ترجمہ الارض فی المیزان کے نام سے شائع ہوا ہے۔اس کتاب میں درج ذیل خطرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان خطرات کا ایک مختصر اقتباس پیش کرتے ہیں:

۱۔کوڑا: شہروں سے نکلنے والا لاکھوں ٹن کوڑا ماحول کے لیے نہایت مہلک ثابت ہو رہا ہے۔ اسے جلانا بھی اس کا حل نہیں ہے کیونکہ اس کے جلانے سے کرۂ ارض کا حفاظتی غلاف متاثر ہوتا ہے۔

۲۔ ہوا کی آلودگی: یہ ایک سنگین مسئلہ ہے جو کسی خاص علاقے سے متعلق نہیں بلکہ عالمی مسئلہ ہے کیونکہ ہوا کی آلودگی شمالی یورپ سے نکلتی ہے، قطبی علاقوں میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ اس سے نہ صرف ہر ذی روح متاثر ہوتا ہے بلکہ یہ درختوں تک کو متاثر کرتی ہے۔

۳۔ اوزون کا سوراخ: کرۂ ارض پر ایک حفاظتی قدرتی غلاف ہے جو سورج کی قاتل شعاعوں کے زمین تک پہنچنے میں فلٹر کا کام کرتا ہے۔ جدید صنعتی کارخانوں سے اٹھنے والی گیسیں اس حفاظتی غلاف کو کھا رہی ہے۔ ان قاتل شعاعوں کے زمین پر پہنچنے سے جلد کا کینسر اور آشوب چشم کی بیماریاں عام ہونے والی ہیں۔ چنانچہ آج بھی شمالی آسٹریلیا میں ۷۵ فیصد لوگ جن کی عمریں ۶۵ سال تک ہیں جلد کے کینسر میں مبتلا ہیں۔

خطرناک یہ ہے کہ اوزون کا سوراخ وسیع تر ہو رہا ہے۔ اس وقت یہ سوراخ امریکہ کے کل رقبے سے تین گنا بڑا ہو چکا ہے۔

۴۔ قدرتی نظافت: زمین کے گرد حفاظتی غلاف اگر آلودہ ہو جائے تو عام حالات میں ایک قدرتی عمل کے ذریعے اس کی صفائی ہوتی ہے لیکن جدید صنعتی تمدن کی وجہ سے

مختلف چیزیں جلانے کے باعث قدرتی صفائی کا عمل متاثر ہو رہا ہے جس کی وجہ سے زمین کے درجہ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے جو نہایت خطرناک ہے۔

۵۔ درجہ حرارت میں اضافہ: درجہ حرارت میں اضافہ ہونا نہایت خطرناک مسئلہ ہے۔ جدید صنعتی پیشرفت سے کرۂ ارض کا غلاف شدید متاثر ہو رہا ہے کیونکہ وہ حرارت جو کرۂ ارض کی فضا میں پھیلتی رہتی تھی وہ مختلف گیسوں کی شکل میں جمع ہو رہی ہے جس کی وجہ سے درجہ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خطرہ صرف درجہ حرارت میں اضافہ ہونے سے نہیں بلکہ اس حرارت سے کرۂ ارض کا کل نظام درہم برہم ہونے کا خطرہ ہے چونکہ اس کی وجہ سے ہوا کی رفتار اور بارشوں کی مقدار میں تبدیلی آنے والی ہے نیز خشک سالی سے قحط کا خطرہ ہے اور امن و سلامتی بھی خطرے میں ہے۔ پانی کی کمی کا بھی خطرہ ہے بلکہ گلیشیرز پگھلنے سے بہت سے ممالک کے سمندر میں غرق ہونے کا خطرہ ہے۔

۶۔ جنگلات کی تباہی: جنگلات میں کمی آنے سے بارشیں کم ہوتی ہیں اور زمین غیر آباد ہوسکتی ہے۔ چنانچہ افریقی ملک اتھوپیا اس کی مثال ہے جہاں جنگلوں کی تباہی کی وجہ سے زمین بنجر ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں وہاں قحط سالی اور خانہ جنگی درپیش ہے۔

۷۔ پانی کی آلودگی: جدید صنعتی آلودگیوں سے پانی میں بہت سا کیمیکل مواد شامل ہو رہا ہے۔ اس کا ایک سبب پانی میں پیٹرول گرنا ہے جس کی وجہ سے امریکہ اور روس کی بعض نہروں میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

پانی کی آلودگی سے پوری دنیا خاص کر تیسری دنیا میں اموات کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جیسے ہیضہ (Cholera)، ٹائیفائڈ، اسہال وغیرہ سے ہونے والی اموات۔

۸۔ ردیات (Waste): عالمی ادارۂ صحت کی ایک رپورٹ کے مطابق تیسری دنیا یورپ کی ٹیکنالوجیکل ردیوں (Technological waste) کی اہم مارکیٹ ہے یہ ردیات نہایت آلودہ، مہلک اور ماحول کے لیے نہایت ضرر رساں ہیں۔ چنانچہ اہل یورپ زہریلی اشیاء، خراب بیج، گلی سڑی غذائی اشیاء، دوائیں اور فاسد

غذائیں تیسری دنیا میں اپنے تجربات کے لیے فروخت کرتے ہیں۔
امریکہ کے اخبارات میں نشر ہونے والی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ۲۶۵ ملین ٹن ردی موجود ہوتی ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے اور یورپ میں سالانہ ۳۵ ٹن ردی موجود ہوتی ہے۔ بعض تبصرہ نگاروں کے مطابق کیمیکل ردیوں کی تجارت بڑے پیمانے پر ہورہی ہے اور اس دھندے میں مختلف مافیا ملوث ہیں۔

عالم اسلام کی علمی خدمات

کتاب المفصل فی الرد علی الحضارۃ الغربیۃ سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:
ڈاکٹر شوقی ابو خلیل اپنی کتاب الحضارۃ الغربیۃ میں لکھتے ہیں:
عصر وسطی میں پورا یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا سوائے ان علاقوں کے جہاں اسلام کی روشنی کی پھیلی۔ جیسے الاندلس **(Al-Andalus)**، صقلیہ سسلی **(Sicily)** جنوبی اٹلی۔ چنانچہ یورپ میں علمی روشنی وہاں سے پھیلی جہاں عربوں کا تمدن پہنچا۔
وہ مزید لکھتے ہیں:
لیکن یورپ والوں کا یہ استفادہ ناقص اور ابتر رہا چونکہ انہوں نے صرف اسلامی تمدن کے مادی پہلو کو لیا اور روحانی و انسانی پہلو اور آفاقی فکر کو نظر انداز کیا جو ہمارے تمدن کی اصل روح تھی۔

طلیطلۃ **(Toledo)** کی درسگاہ

یہ درسگاہ کئی مراحل سے گزری ہے۔ ہر مرحلے میں سینکڑوں کتب اور قلمی نسخوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوتا رہا۔

جب سنہ ۱۰۸۵ء میں یہ شہر مسلمانوں سے واپس لیا گیا تو وہاں کے بادشاہ نے اس شہر کے کتب خانوں میں موجود عربی کتب اور قلمی نسخوں کا لاطینی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔

چنانچہ صرف قرطبہ کے کتب خانے میں پانچ لاکھ سے زیادہ قلمی نسخے موجود تھے۔ چنانچہ اس وقت کے بادشاہ فونسو نے ترجمہ کرانے کی مہم شروع کی۔ اس کام کے لیے اس نے عربی زبان پر عبور رکھنے والوں کی ایک جماعت تیار کی۔ پھر قشتالی عامی زبان میں ترجمہ کرایا۔ اس کے بعد لاطینی فصیح زبان میں ترجمہ کرایا۔

چنانچہ درج ذیل مشاہیر مترجموں نے ترجمے کی مہم جاری رکھی۔
۱۔یوحنا اشبیلی نے عربی کتب کا قشتالی عامی زبان میں ترجمہ کیا۔
۲۔ڈومینیکو نے قشتالی سے لاطینی فصیح زبان میں ترجمہ کیا۔

ان کتب میں ابن سینا کی کتب اور دوسری علمی اور فلسفی کتب شامل تھیں۔

۳۔ جیرار کرمونی نے یونانی اور عربی سے ستر سے زائد کتابوں کا ترجمہ کیا۔ مثلاً کندی کی مرکب ادویہ، ابن سینا کی القانون، زہراوی کی لتصریف کا ترجمہ کیا۔

واضح رہے ابن سینا کی کتاب القانون یورپ کی درسگاہوں میں سولہویں صدی عیسوی تک پڑھائی جاتی رہی ہے۔

رازی کی کتاب المنصوری کی نویں جلد کو انتہائی پذیرائی حاصل رہی۔

ایجادات کی دنیا میں سب سے پہلے طیارہ بنانے کی کوشش عباس فرناس متوفی ۸۸۸ء نے اٹلی کے لیونار دو سے ۶۰۰ سال پہلے کی تھی۔

ابوالحسن بن ہیثم متوفی ۱۰۳۹ء نے پہلی فوٹو بنانے کا تجربہ کیا۔

مسلمان سائنسدان

سارٹن (George Alfred Leon Sarton) اپنی مشہور کتاب تاریخ العلم (History of Science) میں علم کو صدیوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ہر نصف صدی ایک علمی شخصیت سے منسوب کرتے ہیں۔

چنانچہ گزشتہ تین سو پچاس سال ۷۵۰ء سے ۱۱۰۰ء تک ہر نصف صدی میں ایک شخص بھی غیر مسلم نظر نہیں آتا۔ اس طرح یہ سال جابر بن حیان، خوارزمی، رازی، مسعودی، ابو الوفاء، بیرونی، عمر خیام کے ناموں سے منسوب ہیں۔ یہ سب اسلامی ملکوں عرب، ترکستان، افغانستان اور ایران کے مسلمان تھے۔ ان میں کیمیا، الجبراء، طب، جغرافیہ کے ماہرین تھے۔

سارٹن کی کتاب میں ۱۱۰۰ء تک کسی غیر مسلم سائنسدان کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کے بعد ڈھائی سو سال تک مسلم اور غیر مسلم دونوں سائنسدانوں کا ذکر ہے۔ ان میں ابن رشد، نصیر الدین طوسی اور ابن النفیس کا ذکر ملتا ہے۔

موجودہ سائنس و ٹیکنالوجی کا انقلاب دیکھ کر انسان خیال کرتا ہے کہ یہ سب مغرب والوں کی کرشمہ سازی ہے، مسلم دنیا کسی کارنامے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ ذیل میں آپ کو بتاتے ہیں کہ اہلیت اور قابلیت ہمارا ورثہ ہے۔

دنیا کو علم و سائنس سے ہم نے روشناس کرایا ہے۔ البتہ ہم سازشی نہیں ہیں اور انسان سوز عیاری ہمیں نہیں آتی اس لیے ہم پیچھے رہ گئے۔ سازشیوں نے کل ہم سے علم کی روشنائی حاصل کی اور آج ہم سے ہمارا دماغ لے جاتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ ادھر مسلم دنیا دوسروں کو سازش کے ذریعے رام کرنا درکنار دوسروں کی سازشوں کا شکار ہو رہی ہے۔

ہم ذیل میں ان مسلمانوں سائنسدانوں کا ایک مختصر تعارف پیش کرتے ہیں جن کے سامنے مغربی دنیا نے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

ہم یہاں کتاب بناة الفكر العلمي في الحضارة الإسلامية سے چند اسلامی سائنسدانوں کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ جابر بن حیان

پیدائش ۱۰۲ ھ۔ وفات ۱۹۹ ھ بمطابق ۸۱۵ء

جابر بن حیان کی تالیفات ۲۳۲ سے ۵۰۰ تک ہیں۔ ان کی بعض کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ بارہوں صدی عیسوی میں ہوا اور انگریزی میں ترجمہ ۱۶۷۸ء میں ہوا۔ کئی صدیوں تک اہل یورپ کا جابر بن حیان کی کتب پر انحصار رہا خصوصاً جدید کیمیا میں۔ چنانچہ میکس میئرہوف کہتے ہیں:

یورپ میں کیمیا کی ترقی کا سہرا جابر بن حیان کے سر ہے۔

چنانچہ آج بھی یورپ میں جابر بن حیان کی ایجاد کردہ اصطلاحات رائج ہیں۔

ھبۃ الدین شہرستانی کہتے ہیں:

یورپ کے تمام سائنسدان معترف ہیں کہ آج تک جتنے عناصر کا انکشاف ہوا ہے ان میں سے ۱۹ عناصر کا انکشاف جابر بن حیان نے کیا ہے۔

جابر کہتے ہیں:

ان تمام عناصر کا بنیادی عنصر صرف ایک ہے اور وہ ہے الیکٹرک جو ذرہ (ایٹم) میں پوشیدہ ہے۔ جابر کی یہ بات اس الیکٹرون کے قریب ہے جو ایٹم میں موجود ہے۔[1]

۲۔ خوارزمی

متوفی ۲۳۶ ھ۔ ۸۵۰ء

[1] ملاحظہ ہو الدلائل والمسائل بحوالہ اسلام و تمدن غرب

آپ الجبرا کے موسس ہیں اور یورپ وغیرہ میں آج بھی یہ علم الجبرا کے نام سے موسوم ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں ان کی کتب کا لاطینی میں ترجمہ ہوا ہے۔ ان کی کتب سولہویں صدی تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی رہی ہیں۔

۳۔ابن ربّن الطبري

متوفی ۲۴۷ھ۔ ۸۶۱ء

ان کا نام ابو الحسن علي بن ربن سهل الطبري ہے۔ آپ اپنے زمانے کے نہایت حاذق طبیب تھے۔ اکثر امراض کا علاج جانتے تھے۔

ان کی تالیفات میں مشہور فردوس الحكمة ہے۔ جس میں طب کی تمام فروع کا ذکر ہے۔ کتاب عربی میں ہے اور اسی وقت سریانی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور جرمن کی فرینکفرٹ یونیورسٹی نے طبع کیا۔

۴۔ الفرغاني

ابو العباس احمد بن محمد بن كثير الفرغاني متوفی ۲۴۷ھ۔ ۸۶۱ء

یورپ والے انہیں Alfraganus کے نام سے جانتے ہیں۔ فلکیات میں انہیں خاصی مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے زمین کا قطر ۶۵۰۰ میل بتایا اور بعض سیارات کا بھی۔

الڈومییلی کہتے ہیں: فرغانی نے سیارات کی جو مسافت اور حجم بتایا ہے اس پر بہت سے لوگوں نے عمل کیا حتیٰ کوپرنیکس (Copernicus) نے بھی۔ اسی وجہ سے یورپ میں فلکیات کے عروج میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

تالیفات: جوامع علم النجوم والحركات السماوية۔ اس کتاب کا ترجمہ بارہویں صدی عیسوی میں لاطینی اور عربی زبان میں ہوا۔

۵۔اولاد موسی

موسی بن شاکر خلیفہ مامون کے مقربین میں سے تھا اور علم فلک اور نجوم میں مہارت رکھتا تھا۔موسی بن شاکر کے انتقال کے وقت اس کے تین چھوٹے بچے تھے۔ مامون نے ان بچوں کو اہم تعلیمی ادارے بيت الحكمة میں داخل کرایا۔ یہ تینوں بچے آگے چل کر مختلف علوم میں ماہر ہو گئے۔ ان کی تالیفات میں الحيل زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے تجربات بیان کیے ہیں۔

یورپ اس کتاب کی طرف انیسویں صدی میں متوجہ ہوا اور بیسویں صدی میں اس کتاب پر پوری توجہ دی گئی۔ سنہ ۱۹۷۹ء میں ھیل (Hill) نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۶۔ کندي

انہیں عرب فلسفی کہتے ہیں۔ ان کا نام یعقوب بن اسحاق ابن الصباح الکندي ہے۔ قبیلہ کندہ سے تعلق تھا۔ لاطینی میں انہیں Alkindus کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کندي کو فلکیات، طب، فزکس میں خاصی مہارت حاصل تھی۔ ان کی تالیفات کی تعداد ۲۷۰ سے ۳۰۰ تک ذکر کی جاتی ہیں۔ ان کی اکثر کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا اور صدیوں تک ان کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا ہے۔

۷۔ رازي

محمد بن زکریا رازي متوفی ۳۱۳ ھ۔ لاطینی میں انہیں Rhazes کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ آپ نہایت حاذق اور مشہور طبیب، کیمیادان اور فلسفی تھے۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ عالم اسلام میں سب سے عظیم طبیب تھے اور دنیا کے عظیم طبیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

اہل مغرب امراض نسواں، بچوں کی پیدائش، آنکھوں کی بیماری، مثانہ وغیرہ کے بارے میں ان کی ایجادات کے معترف ہیں۔

کیمیا کے بارے میں ان کے تجربات پر آج بھی عمل ہو رہا ہے۔

ان کی تالیفات ۲۰۰ سے زائد ہیں۔

الحاوي ان کی نہایت مشہور تالیف ہے جو بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ۱۲۷۹ء میں لاطینی میں اس کا ترجمہ ہوا اور یورپ میں کئی بار اس کا ترجمہ ہوا۔ سولہویں صدی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں یہ کتاب پڑھائی جاتی رہی اور سنہ ۱۵۴۲ء میں پانچ مرتبہ طبع ہوئی۔

الجذري و الحصبة: اس میں ریڈیکل اور خسرہ کے معالجے کے بارے میں مفصل اور دقیق معلومات موجود ہیں۔ ۱۵۶۵ء میں لاطینی میں اس کا ترجمہ ہوا پھر یورپ کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور یورپ میں چالیس مرتبہ سے زائد نشر ہوئی۔

المنصوري: یہ کتاب جراحت، آنکھوں کے علاج، امراض شکم پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں توجہ کا مرکز رہی ہے۔

هيئة العالم: اس میں رازي نے ذکر کیا ہے کہ زمین دو محوروں پر گھومتی ہے اور سورج زمین

سے بڑا اور چاند زمین سے چھوٹا ہے۔

۸۔ البستاني

ابو عبداللہ محمد بن جابر بن سفان الرقي الحراني البستاني **متوفی ۳۱۷ھ۔**

آپ کو فلکیات، الجبرا، جعفرافیہ، انجینئرنگ میں کافی مہارت تھی۔ بعض لوگ انہیں بطلیموس العرب **کہتے ہیں۔**

ان کی تالیفات میں مشہور ذیج الصافی **ہے۔ یہ** بستاني **کی تالیفات میں سب سے اہم ہے۔ اس میں فلکیات کے بارے میں ان کے تجربات کے اہم نتائج درج ہیں۔ اس کتاب کا فلکیات کی اہم پیشرفت میں دخل ہے۔ یورپ کی تعلیمی تحریک میں بھی اس کتاب کا بڑا دخل ہے۔**

اس کتاب کا ترجمہ لاطینی میں بارہویں صدی عیسوی میں ہوا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ بنام ''Science Stors'' علم النجوم **ہوا اور ۱۵۳۷ء میں طبع ہوئی۔ تیرہویں صدی عیسوی میں اسپین کے بادشاہ کے حکم پر اس کتاب کا اسپین کی زبان میں ترجمہ ہوا اور ۱۹۰۷ء میں یہ کتاب تین جلدوں میں اصل عربی، ترجمہ لاطینی کے ساتھ طبع ہوئی۔**

۹۔ فارابي

محمد بن محمد بن طرخان ابو نصر الفارابي **متوفی ۳۳۹ھ۔**

آپ کو معلم ثانی کہتے ہیں چونکہ آپ نے معلم اول ارسطو کی کتاب پر تحقیق کی اور اس پر شرح بھی لکھی۔ فارابي **مسلمانوں میں سب سے بڑے فلسفی مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے دین اور فلسفہ میں ہمآہنگی پیدا کی۔**

تالیفا : احصاء العلوم**۔ اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ ہوا ہے۔**

۱۰۔عبدالرحمن صوفی

ابو الحسن عبدالرحمن عمر صوفی **متوفی ۳۷۹ھ۔**

آپ نجوم و فلکیات میں بڑے ماہر تھے۔ علم نجوم میں ان کی خدمات کے اہل یورپ معترف ہیں چونکہ انہوں نے بہت سے قدیم ماہرین فلکیات کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔

تالیفات: الكواكب الثابتة**۔ یہ ان کی کتابوں میں سب سے مشہور ہے۔**

۱۱۔ابو الوفاء بوزجانی

محمد بن محمد بن یحیی بوزجانی **متوفی ۳۸۷ھ۔**

ابو الوفاء فلکیات میں ماہر تھے۔ چنانچہ اہل مغرب ان کی مہارت کے معترف ہیں۔ بعض یورپ والوں کا کہنا ہے کہ علم مثلثات ان کی تحقیقات کی وجہ سے زیادہ واضح اور آسان ہو گیا۔

تالیفا : الکامل۔ اس کتاب کے بعض حصوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا ہے۔

۱۲۔ المجریطی

ابو القاسم مسلمة بن احمد المجریطی متوفی ۳۹۸ھ

علم کیمیا میں آپ اپنے زمانے کی منفرد شخصیت تھے اور ریاضیات و فلکیات میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔

تالیفا : غایة الحکیم۔ یہ کتاب تاریخ کیمیا پر مشتمل ہے۔ ۱۲۵۲ء میں اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ ہوا ہے۔

رسالة فی الاسطرلاب۔ اس کتاب کا بھی لاطینی میں ترجمہ ہوا ہے۔ واضح رہے مجریطی کی متعدد تالیفات یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔

۱۳۔ ابن جزار

ابو جعفر احمد بن ابراهیم بن الجزار متوفی ۳۹۹ھ۔

لاطینیوں میں Algizar کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کو طب میں خاصی مہارت تھی۔

تالیفا : زاد المسافر۔ یہ طب میں ان کی مشہور ترین کتاب ہے۔

اس کتاب کا لاطینی، یونانی اور عبری میں ترجمہ ہوا اور سولہویں صدی تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہی ہے۔

۱۴۔ الزهراوی

ابو القاسم خلف بن عباس الزهراوی متوفی ۴۰۴ھ۔

مغرب میں Abulcssis کے نام سے مشہور ہیں۔

زهراوی کی طب کے موضوع پر ایجادات بہت ہیں اور خصوصاً جراحت میں تو وہ زیادہ ماہر تھے اور تاریخ میں پہلی بار سرجری کو مستقل علم کے طور پر متعارف کرایا۔ چنانچہ انہوں نے پہلی بار مثانے کا آپریشن کیا۔ اپنے شاگردوں کو زخم سینے کی تعلیم دیتے جو دو سوئیوں ایک دھاگہ سے سیتے تھے۔

تالیفا : التصریف لمن عجز عن التالیف۔ یہ کتاب ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے اور طب کے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی سرجری پر مشتمل جلد کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔

اس کا ایک ایڈیشن ۱۴۹۷ء، دوسرا ۱۵۴۱ء اور تیسرا اکسفورڈ میں ۱۷۷۸ء میں شائع ہو چکا ہے اور فرانسیسی (french) میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ اس کتاب کے تیسری حصے کا یورپ میں فن جراحت کی تعلیم میں بڑا کردار رہا ہے اور یہ پانچ صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہی ہے۔

۱۵۔ الکرخی

ابو بکر محمد بن الحسن الکرجی متوفی ۴۲۰ھ

مسلمانوں میں سب سے بلند پایہ ریاضی دان ہیں۔

تالیفا : الفخري فی الجبرا۔ ۴۰۲ھ اور ۴۰۷ھ کے درمیان اس کتاب کی تالیف کی گئی۔ سمتھ اپنی کتاب تاریخ ریاضیات میں لکھتے ہیں:

۱۔المفخری الجبرا کے موضوع پر اہم ترین کتاب ہے۔

اس کتاب کا ۱۸۵۳ء میں فرانسیسی (french) میں ترجمہ ہوا ہے۔

۲۔الکافی فی الحساب: اس کتاب کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا اور ۱۸۷۸ء میں شائع ہوئی۔

۱۶۔ ابن سینا

ابو علي حسين بن عبداللہ بن سینا متوفی ۴۲۸ھ۔

دنیا میں مسلمان دانشوروں میں سب سے عظیم اور مشہور شخصیت ہیں اور آپ کو شیخ الرئیس اور معلم ثالث کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ارسطو اور فارابی کے بعد ان کا رتبہ آتا ہے۔ یورپ میں Avicenna کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آپ بخارا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بخارا میں حاصل کی۔ چنانچہ درس قرآن، اصول، لغت، ادبیات، فلسفہ، منطق ،ہندسہ (Geometry) علم نجوم، طب، فزکس میں مہارت حاصل کی۔ خصوصاً طب، فلکیات، ریاضیات اور فلسفہ میں اس وقت اتھارٹی مانے جاتے تھے جب کہ ان کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔

انہیں زمانے کے سیاسی رہنماؤں کی قربت حاصل رہی چونکہ وہ ان کا علاج کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ابن سینا کو سب سے زیادہ طبابت کے میدان میں شہرت ملی۔ چنانچہ انہوں نے پہلی بار نفسیاتی بیماریوں کا کھوج لگایا اور پہلی بار بتایا کہ نفسیاتی عوامل انسانی جسم کے اعضاء پر بہت اثرات مترتب کرتے

ہیں۔ پہلی مرتبہ دماغی سکتہ کا انکشاف کیا کہ خون کا دباؤ زیادہ ہونے سے دماغی سکتہ واقع ہوتا ہے اور دیگر بہت سے طبی انکشافات اور بہت سی دوائیں ایجاد کی ہیں۔

تالیفا :تالقانون۔ طب کے موضوع پر یہ ان کی شہرہ آفاق کتاب ہے اور دنیائے شرق و غرب میں اس کتاب کو بڑی شہرت اور پذیرائی ملی۔

چنانچہ بارہویں صدی عیسوی میں اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ ہوا اور پندرہوں صدی عیسوی کے بعد سولہ ایڈیشن طبع ہوئے۔ ان میں سے ایک عبرانی میں اور باقی لاطینی میں اور سولہویں صدی عیسوی میں بیس مرتبہ طبع ہوئی۔ انیسویں صدی تک یورپ میں پڑھائی جاتی رہی اور ۱۹۹۶ء میں فرینکفرٹ یونیورسٹی سے طبع ہوئی۔

۱۷۔ابن الهیثم

ابو علی الحسن بن الحسن بن الهیثم متوفی ۴۳۰ھ

مغرب والوں کے ہاں انہیں الهازن (Al Hazen) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ بصریات، ریاضی، فزکس، طب اور فلسفہ میں مہارت رکھتے تھے۔

علم بصریات میں پیشرفت ان کی مرہون منت ہے۔ مورخ جارج سارٹن (George Sarton) کہتے ہیں کہ آپ فزکس میں سب سے بڑے ماہر تھے۔

ابن ہیثم نے پہلی مرتبہ انکشاف کیا کہ عدسہ (Lens) چیزیں بڑی کر کے دکھاتا ہے اور پہلی مرتبہ آنکھوں کی اجزائے ترکیبی کی وضاحت کی اور ان اجزاء کے نام تجویز کیے جن کا اہل مغرب نے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اور آج تک رائج ہیں۔ مثلاً آنکھ کے شبکیہ کو'' Retina '' قرنیة کو Cornea' وغیرہ۔

ابن ہیثم نے ہی نشاندہی کی کہ جسم پر پڑنے والی روشنی آنکھوں کے پردے پر پڑنے کی وجہ سے اعصابی رگوں کے ذریعے دماغ تک پہنچنے سے رویت متحقق ہوتی ہے۔ ابن ہیثم نے اقلیدس، بطلیموس اور یونانی حکیموں کا یہ نظریہ باطل ثابت کیا کہ روشنی آنکھوں پر پڑنے اور آنکھوں سے جسم پر پڑنے کی وجہ سے رویت متحقق ہوتی ہے۔

آپ کو فلکیات میں بھی مہارت حاصل تھی اور سیاروں کی حرکت کے بارے میں اپنا ایک نظریہ قائم کیا۔ چنانچہ ناسا (NASA) میں ایک میز آج بھی موجود ہے جو ۱۴۲۶ء میں جرمن میں بنائی گئی تھی۔

اس پر سیاروں کی حرکت کے بارے میں ابن ہیثم کے نظریے کے مطابق تصویر بنائی گئی ہے۔

تالیفا: المناظر۔ یہ کتاب بصریات، روشنی، آنکھوں کی تشریح اور رویت کے بارے میں پہلی بار پوری وضاحت پر مشتمل ہے اور علم بصریات میں انہوں نے ایک انقلاب پیدا کیا۔ مغرب والوں خاص کر روجر بیکون (RogerBacon) اور کیبلر پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہے اور صدیوں تک اسی کتاب پر انحصار رہا ہے۔ چنانچہ کئی بار لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔

بعض اہل تحقیق کے مطابق ابن ہیثم نے فرانسس بیکن (Francis Bacon) سے پہلے مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی تجربیات کا ایک جامع لائحہ عمل مرتب کیا تھا۔

عباس محمود العقاد کہتے ہیں: ابن ہیثم کی کتب کے ترجموں پر یورپ نے بصریات پر پورا اعتماد کیا۔

۱۸۔البیرونی

ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی خوارزمی متوفی ۴۳۹ھ۔

البیرونی کو ریاضیات، فزکس، فلکیات، طب، تصوف، ادیان، تاریخ، لغت اور ادبیات میں مہارت حاصل تھی۔

مورخ جارج سارٹن (George Sarton) کہتے ہیں:

البیرونی تلاش علم میں نکلنے والے فلسفی، ریاضی دان، فلکیات اور جغرافیہ کے ماہر تھے۔ وہ عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کے بڑے دانشوروں میں شامل ہیں۔

وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ یونانی، سنسکرت، فارسی، عبرانی اور عربی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ آپ نے ہندوستان میں ایک عرصہ گزارا ہے۔

تالیفا: الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیہ۔

اس کتاب میں انہوں نے زمین کی گردش اور زمین کی سطح کے بارے میں بحث کی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ Sachau نے کیا ہے۔ لندن میں ۱۷۸۹ء طبع ہوئی اور انیسویں صدی عیسوی میں جرمنی اور انگلش میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف علوم میں ان کی ایک سو سے زائد تالیفات ہیں۔ ان کی بیشتر کتابوں کا فرینچ، جرمن اور انگلش زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں چھپتی رہی ہے۔

۱۹۔ابن رضوان

ابو الحسن علي بن رضوان بن علي بن جعفر **متوفی ۴۵۳ھ۔**

آپ ماہر طبیب، ریاضی دان، منجم اور فلسفی تھے۔

تالیفات: ۱۔دفع مضار الابدان بارض مصر۔ **اس کا ترجمہ میکس مئر ہوف نے کیا ہے۔**

۲۔ شرح الصناعة الصغیرة لجالینوس۔ **اس کتاب کو بڑی شہرت ملی۔ اس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا اور سنہ ۱۴۹۶ء میں طبع ہوئی۔**

۲۰۔الزرقالي

ابراهیم بن یحیي النقاش **متوفی ۴۸۰ھ۔ لاطینی میں Arzachel نام سے مشہور ہیں۔**

آپ فلکیات میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

اہل مغرب زرقالي **کے فلکیاتی علوم سے مرعوب تھے اور خوب استفادہ کیا۔ چنانچہ بارہویں صدی عیسوی میں** جیرار **نے** زرقالي **کے کارناموں کا لاطینی میں ترجمہ کیا اور پندرہویں صدی عیسوی میں** راجیو مونتاینوس **نے ایک کتاب تالیف کی جو** زرقالی **کے علوم کے فوائد پر مشتمل تھی اور سنہ ۱۵۳۰ء میں** بارفیری **نے** زرقالی **کی کتاب پر حاشیہ لکھا اور ۱۵۳۰ء میں** کوپرنیکس **(Copernicus) نے اپنی کتاب** دوران اجرام سماویه **میں** زرقالی **اور** بتانی **کے نظریات سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔**

۲۱۔ابن جزله

ابو علی یحیی بن عیسی بن جزله **متوفی ۴۹۳ھ۔**

پہلے مسیحی تھے بعد میں اپنے استاد ابو علی بن الولید **سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ آپ کو طبابت میں اچھی مہارت تھی بلکہ اپنے زمانے کے** امام الطب **مانے جاتے تھے۔**

تالیفات: تقویم الابدان فی تدبیر الإنسان۔

اس کتاب میں ۳۵۲ بیماریوں کے نام اور ان کے علاج کا ذکر ہے اور ۱۵۳۲ء میں لاطینی میں ترجمہ ہوا اور سٹراسبر گ (Strasbourg) میں شائع ہوئی۔ ان کی دیگر تصنیفات بھی ہیں۔

۲۲۔ عمر خیام

فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر، فلسفی، ریاضی دان، ماہر فلکیات، لغت، فقہ اور تاریخ میں بھی

مہارت رکھتے تھے۔

شروع میں خیمہ سازی ان کا پیشہ تھا۔ اس لیے خیام کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد میں سرکاری دربار میں قربت حاصل ہونے کی وجہ سے معیشت بہتر ہوئی اور تعلیم پر توجہ دی۔

تالیفات :الجبر و المقابلہ۔ اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا اور ۱۸۵۱ء میں پیرس سے شائع ہوئی اور اس کا انگلش ترجمہ ۱۷۳۱ء میں شائع ہوا۔

ان کی عالمگیر شہرت ان کی رباعیات کی وجہ سے ہوئی جو شعر و ادب میں شاہکار ہیں۔ ان رباعیات کا لاطینی، فرانسیسی، انگلش اور جرمنی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من
وین حرف معمہ نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوئے من و تو
چون پردہ برافتاد نہ تو مانی و نہ من

۲۳۔ ابن باجہ

ابوبکر محمد بن یحیی السرقسطی ابن باجہ متوفی ۵۳۳ھ۔

یورپ والے انہیں Avenpace کے نام سے جانتے ہیں

تالیفات: ان کی تالیفات تیس تک ہیں۔ اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں۔ چند ایک رسائل کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں ہوا ہے۔

۲۴۔ ابو مروان ابن زہر

متوفی ۵۵۷ھ۔

طبابت میں ماہر تھے اور اس فن میں نئے تجربات کیے اور بہت سے امراض کا انکشاف کیا۔ پھیپھڑوں کی بیماری پر تحقیق کی اور اس میں آپریشن بھی کیے۔ ان کے دوست ابن رشد کہتے ہیں کہ وہ جالینوس کے بعد عظیم طبیب تھے۔

یورپ میں ابن زہر کی طبابت کی تاثیر سترہویں صدی ہجری تک باقی رہی۔

تالیفات :التیسیر فی المداواۃ والتدبیر

۱۴۹۰ء میں اس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا اور سترہویں صدی عیسوی تک یورپ میں اس کتاب کے ثمرات باقی رہے۔

۲۔ الاغذیۃ والادویۃ۔ اس کتاب میں علاج بالغذاء اور علاج بالدواء دونوں کے مختلف طریقوں کا ذکر ہے۔ اس کتاب کا بھی لاطینی میں ترجمہ موجود ہے۔

۲۵۔ ابن طفیل

ابوبکر محمد بن عبدالمالک الاندلسی متوفی ۵۸۱ھ۔

آپ طبابت، فلسفہ اور فلکیات میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ آپ نے فلکیات کے موضوع پر بطلیموس کے مفروضات کو مسترد کیا۔ چنانچہ فرانس کے ایک سائنسدان احتمال دیتے ہیں کہ ممکن ہے کوپرنیکس اور گلیلو نے جو جدید فلکی نظریات چار صدی بعد قائم کیے ہیں ان کی بنیاد ابن طفیل کے مفروضات پر ہو۔

تالیفات: ان کی متعدد تالیفات ہیں۔ ان میں زیادہ شہرت کی حامل حی بن یقظان ہے۔

اس کتاب میں فلسفے کا موضوع افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور دین و فلسفہ میں اتفاق کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو بڑی پذیرائی ملی اور مغرب میں سترہویں صدی سے شہرت ملی اور متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا جیسے لاطینی، عبرانی، انگلش، فرنچ، جرمن اور ولندیزی زبانوں میں۔

۲۶۔ ابن رشد

ابو الولید محمد بن احمد بن محمد الاندلسی متوفی ۵۹۵ھ

مغرب میں Averroes کے نام سے مشہور ہیں۔

فلسفہ، طبابت اور فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔

ابن رشد، صحت کے لیے صحت مند غذا و مشروبات اور صاف ہوا کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور دوائیوں کے منفی اثرات (Side Effect) پر توجہ دیتے اور کہتے تھے کہ دوائی کا منفی اثر جگر اور گردوں پر زیادہ ہوتا ہے۔

تالیفا :الکلیات فی الطب۔ یہ ان کی تالیفات میں اہم تالیف ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ لاطینی میں تیرہویں صدی عیسوی میں Colliget کے نام سے ہوا اور عبرانی میں بھی ترجمہ ہوا لیکن اصل عربی میں ۱۹۸۴ء کے بعد نیو دہلی سے نشر ہوئی۔

ابن رشد بارہویں صدی عیسوی کے عظیم مفکر تھے اور مغرب سولہویں صدی تک ان کے افکار کے زیر اثر رہا۔

۲۷۔ابن الرزاز

بدیع الزمان ابو العز اسماعیل بن الرزاز الجزری

آپ کی ایجادات اور مکینیکل کارنامے نہایت قابل توجہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مختلف صنعتوں کے آلات ایجاد کیے۔

ڈونالڈھیل کہتے: انہوں نے پانی سے چلنے والی گھڑی اور قندیل کے فتیلے سے حرکت کرنے والی گھڑی بنائی تھی۔

تالیفا : الجامع بین العلم والعمل۔ یہ ان کی تالیفات میں اہم ترین ہے جس میں گھڑی سازی، پانی کے فوارے اور پانی پمپ کرنے کی مشین بنانے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب قرون وسطی میں لکھی گئی کتابوں میں انوکھی ثابت ہوئی جس میں مکینیکل (Mechanical) آلات بنانے کے تجربات بیان کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کو مغرب میں بڑی شہرت ملی۔ اس کے بعض حصوں کا ترجمہ بیسویں صدی کے اوائل میں جرمن زبان میں ہوا اور ڈونالڈ نے انگلش میں ترجمہ کیا۔

۲۸۔البطروجی

ابو اسحاق نور الدین البطروجی متوفی ۶۰۰ھ۔

مغرب میں آپ Alpetragius کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ بطروجی نے فلکیات میں جدید نظریہ پیش کیا جس سے نظریہ اودکسوس (Eudoxos) کا احیا ہوا۔ البتہ اس نظریے کی کچھ تصحیح اور بطلیموس کے نظریہ پر تنقید بھی کی گئی۔ اس طرح کوپرنیکس کے نظریے کا راستہ ہموار ہوا۔

تالیفا : الفلك۔ یہ کتاب یورپ میں زیادہ مشہور ہوئی اور تیرہویں صدی عیسوی میں لاطینی اور سولہویں صدی عیسوی میں عبرانی میں ترجمہ ہوا۔ لاطینی ترجمہ وینا جارجیا میں ۱۵۳۱ء میں شائع ہوا۔

۲۹۔ابن البیطار

ابو محمد عبد اللہ بن احمد ضیاء الدین الاندلسی متوفی ۶۴۶ھ۔

یہ اپنے زمانے کے عظیم کیمسٹ اور نباتات کے بہت ماہر تھے۔

علم نباتات کے سلسلے میں ابن بیطار نے ۱۴۰۰ جڑی بوٹیوں کے خواص بیان کیے۔ ان میں سے ۳۰۰ جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں انہوں نے پہلی بار بیان کیں۔

تالیفا :جامع مفردات الادویۃ والاغذیۃ۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۹۱ء میں شائع ہوئی اور اس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ جدید علمی تحریک تک اہل مغرب اس کتاب کی طرف رجوع کرتے رہے۔

۳۰۔نصیر الدین الطوسی

ابو جعفر محمدبن محمدبن الحسن الطوسی متوفی ۶۷۲ھ۔

چھٹی صدی ہجری میں ابھرنے والی عظیم منفرد شخصیت ہیں۔ اس زمانے کے خلفاء اور امراء کے ہاں انہیں بہت پذیرائی ملی جس کی وجہ سے حاسدین نے ان کے خلاف دربار میں جھوٹے الزامات لگائے۔ نتیجۃً انہیں قلعۃ الموت میں قید کر دیا گیا۔ البتہ اپنی تحقیقات جاری رکھنے کی اجازت انہیں حاصل رہی۔ چنانچہ قید کے دنوں میں انہوں نے بہت سی تالیفات کیں۔

جب سنہ ۶۵۶ ہجری میں منگول بادشاہ ہلاکو خان بغداد پر قابض ہوا تو اس نے اپنے دشمن عباسیوں کے علماء سے استفادہ کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ نصیر الدین طوسی کو آزاد کیا اور اپنے قریب کیا۔ انہیں مراغہ شہر میں قائم ہونے والے رصدگاہ کا مدیر بنایا۔ ہلاکو نے دنیا کے مختلف علاقوں سے جن دانشوروں کو بلایا نصیر الدین طوسی کو ان کا سربراہ بنا دیا۔ وہ دانشور تھے: دمشق سے المؤید المعرضی، موصل سے فخر المراغی اور نجم الدین قزوینی، محی الدین الغربی۔ اس رصدگاہ میں ایک کتب خانہ بھی بنایا جس میں چار لاکھ کتب موجود تھیں۔

طوسی نے فلکیات میں ایک ایسا نظام متعارف کرایا جو بطلیموس کے نظریات سے وسیع تر تھا۔ چنانچہ ان نظریات نے کوپرنیکس (Copernicus) کی فلکیاتی اصلاحات کے لیے زمین ہموار کی۔

تالیفا :طوسی نے مثلثات، فلکیات، ہندسہ، حساب، تقویم، طبابت، جغرافیہ، اخلاقیات اور موسیقی کے موضوعات پر کتابیں لکھیں۔

تالیفا :۱۔ ان میں مشہور کتاب شکل القطاع ہے۔ کہتے ہیں یہ پہلی کتاب ہے جس میں حساب مثلثات اور علم فلک میں فرق بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا لاطینی، فرینچ اور انگلش میں ترجمہ ہوا ہے اور یورپ والے کئی صدیوں تک اس کتاب سے استفادہ کرتے رہے۔

۲۔التذکرۃ النصیریۃ۔ یہ علم فلک کے موضوع پر ہے جس میں فلکیات پر جدید نظریات قائم کیے گئے اور بطلیموس کی کتاب المجسطی پر تنقید کی ہے۔ سارٹن کہتے ہیں: بطلیموس پر تنقید

سے طوسی کی علمی مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔

طوسی کی دیگر بہت سی کتابوں کا لاطینی و دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔

۳۱۔ابن النفیس

علاء الدین علی بن ابی الحزم قرشی متوفی ۶۸۷ھ۔

آپ علم طب میں ابن سینا کے ہم رتبہ مانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلسفہ، منطق، نحو اور علم شریعت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

آپ نے پہلی مرتبہ انسانی جسم میں گردش خون کا درست نظریہ قائم کیا اور انکشاف کیا کہ پھیپھڑوں کے ذریعے خون کی گردش ہوتی ہے۔ پھیپھڑوں میں ہوا نہیں ہوتی جیسا کہ جالینوس نے دعویٰ کیا ہے بلکہ پھیپھڑوں میں خون ہوتا ہے۔ اس طرح اس راز کا انکشاف **Migul Cerrede** سے پہلے ابن النفیس نے کیا ہے جب کہ یورپ والے اس راز کا انکشاف مائیکل سے منسوب کرتے ہیں۔

تالیفات: ۱۔شرح تشریح القانون۔ یہ کتاب ابن سینا کی کتاب القانون کے باب التشریح کی شرح ہے۔

۲۔موجز القانون۔ اس کتاب کا ترجمہ عبرانی اور انگلش میں ہوا۔ ۱۸۳۸ء میں شائع ہوئی۔

۳۲۔الحسن المراکشی

ابو علی الحسن بن علی بن عمر متوفی ۶۶۰ھ۔

انہیں فلکیات، ریاضیات، جغرافیہ اور شمسی گھڑی بنانے میں مہارت تھی۔

تالیفا: تجامع المبادی۔ اس کتاب کی وجہ سے مغرب میں مراکشی کی شہرت ہوئی اور انہیں مسلمانوں کا عظیم فلکیاتی ماہر تسلیم کیا گیا۔

اس کتاب کا امانویل سیدیو نے ترجمہ کیا اور سنہ ۱۶۳۶ء میں شائع ہوئی۔

۳۳۔قطب الدین شیرازی

محمود بن سعود بن مصلح الفارسی متوفی ۷۱۰ھ

آپ نصیر الدین طوسی کے شاگرد تھے اور ریاضیات، فلکیات، فزکس اور فلسفہ میں بلند مقام رکھتے تھے۔

قطب الدین پہلے شخص ہیں جنہوں نے قوس وقزح کی درست تشخیص کی اور کہا: قوس وقزح

سورج کی شعاعیں بارش کے قطروں پر پڑنے سے دکھائی دیتی ہے۔

تالیفات: نهاية الادراك فی دراية الافلاك۔ سارٹن کے مطابق یہ کتاب مختلف موضوعات پر مشتمل ہے جیسے فلکیات، زمین شناسی، سمندر کے بارے میں معلومات وغیرہ۔

۳۴۔ ابن البناء

احمد بن محمد بن عثمان الازدی متوفی ۷۲۱ھ۔

انہیں حساب، ہندسہ، الجبرا، فلکیات، ریاضیات اور علم نجوم میں کافی مہارت حاصل تھی۔

مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان کی اہم تالیف تلخيص اعمال الحساب ہے۔

سمتھ اور سارٹن دونوں کو اعتراف ہے کہ حساب کے موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے اور اہل مغرب سولہویں صدی عیسوی تک اس کتاب پر عمل کرتے رہے۔

سنہ ۱۸۶۴ء میں **Marre** نے فرنچ میں ترجمہ کیا۔

۳۵۔ ابن الشاطر

ابو الحسن علاء الدین علی بن ابراهیم متوفی ۷۷۷ھ

ہندسہ، فلکیات اور حساب میں مہارت حاصل تھی۔

انہوں نے کوپرنیکس سے صدیوں پہلے پہلی مرتبہ انکشاف کیا تھا: زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور چاند زمین کے گرد گھومتا ہے۔

ان کی فلکیات وغیرہ پر متعدد تالیفات ہیں۔

۳۶۔ الکاشی

غیاث الدین بن مسعود بن محمد الکاشی متوفی ۸۳۹ھ

انہیں ریاضیات اور فلکیات میں عبور حاصل تھا۔

سمتھ اپنی کتاب تاریخ ریاضیات[1] میں لکھتے ہیں:

اگرچہ ریاضیات کے علماء میں اختلاف بہت ہے لیکن ان میں سے اغلب اس بات پر متفق ہیں کاشی ہی نے ریاضیات میں ایجاد وابتکار کیا ہے۔

تالیفات: ان کی تالیفات میں سب سے اہم مفتاح الحساب ہے جسے مشرق ومغرب کے

[1] History of Mathmatics by Eugene Smith David.

دانشور اپنے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں شامل تدریس کرتے تھے۔

۳۷۔الغ بیگ

الغ بیگ محمد تورغای بن شاہ رخ بن تیمور متوفی ۸۵۳ھ

بیس سال کی عمر میں ان کے والد نے انہیں ترکستان اور ماوراء النہر کے ملکوں کا امیر بنایا اور چالیس سال تک اس نے حکومت کی۔ اس دوران علم وفنون میں بہت بڑی خدمات انجام دیں۔ انہوں نے سمرقند میں ایک عظیم رصدگاہ بنائی جو اس زمانے کے دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی تھی۔

الغ بیگ ماہر فلکیات ہونے کے ساتھ ادیب مورخ اور فقیہ بھی تھے۔

تالیفا :زیائچہ الغ بیگ جس میں رصدگاہ سے حاصل شدہ نتائج درج ہیں یہ کتاب پہلی بار سنہ ۱۶۵۰ء میں لندن میں طبع ہوئی بعد میں یورپین زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

کتاب ظلام من الغرب میں غزالی لکھتے ہیں:

لائن پول کہتے ہیں: اسپین آٹھ صدیوں تک مسلمانوں کے قبضے رہا جس کے تمدن سے یورپ میں روشنی آئی اور فاتح قوم یعنی مسلمانوں کی کوششوں سے زمینیں شاداب ہوئیں اور مختلف وادیوں میں بڑے بڑے شہر بسائے گئے۔ پھر (ان کے جانے کے بعد) یہ سب نابود ہو گیا اور اس عظمت کا صرف نام رہ گیا۔ ادب، فن اور علم صرف یہاں پروان چڑھے، باقی یورپ محروم تھا۔ فلکیات، ریاضیات، تاریخ، فلسفہ وغیرہ سب عربی اسپین میں پھلا پھولا اور غرناطہ کے سقوط کے بعد اسپین کی عظمت ختم ہو گئی اور ہر سو تاریکی چھا گئی۔ صنعت ختم، ادارے تباہ، طالب علموں اور تجارت کی جگہ چوروں اور بدمعاشوں نے لے لی۔

رابرٹ بریفولٹ (Robert Briffault) کہتے ہیں:

یورپ پندرہویں صدی عیسوی میں اسلامی درسگاہوں کے علم سے سیراب ہوتا رہا اور ان کا طریقہ تعلیم اور تجربہ پہلی بار عالم اسلام سے لیا جس کا روجر بیکون (Roger Bacon) اور فرانسس بیکون (Francis Bacon) دونوں کو اعتراف ہے۔

وہ اپنی کتاب Making of Humanity میں لکھتے ہیں:

روجر بیکون نے عربی زبان اور عربی علوم اکسفورڈ یونیورسٹی میں اندلس کے عربی

اساتذہ سے حاصل کیے لہٰذا روجر بیکون اور اس کے ہم مقام فرانسس بیکون کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دعویٰ کریں کہ تجرباتی طریقہ تعلیم انہوں نے ایجاد کیا۔روجر بیکون صرف عالم اسلامی کے علوم یورپ منتقل کرنے والے قاصد کی حیثیت رکھتے ہیں اور خود انہوں نے بھی اس بات کی تصریح کرنے میں تامل نہیں کیا کہ عربی زبان اور عربی علوم ہی حقیقی علوم کے حصول کا ذریعہ تھے۔

مزید کہتے ہیں:

نئی دنیا میں عربی تمدن کی علمی فیاضی سب سے اہم ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

صرف علمی فیاضی نے یورپ کو حیات نہیں بخشی بلکہ دیگر اسلامی تمدن کے اثرات نے بھی یورپ پر اپنی ضوفشانی کی ہے۔

مزید کہتے ہیں:

یورپ میں جس قسم کی بھی علمی روشنی دیکھنے میں آتی ہے اس کی اصل اور بنیاد یقینی طور پر اسلامی ثقافت ہے۔[1]

مغربی ثقافت نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں صرف عالم مادیات میں منحصر رکھی ہیں انسان کو سمجھنے کی کوشش نہیں۔ اگر کی ہے تو صرف انسان کے مادی پہلو پر۔

تجرباتی علوم نہ ہونے سے مادی خسارہ ہوتا ہے اور انسانی علوم نہ ہونے سے انسان اندر سے کھوکھلا ہو جاتا اور انسانیت خسارے میں چلی جاتی ہے جو ناقابل تلافی ہے۔

کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟

تعجب کا مقام ہے کہ آج بھی یہ کہا جاتا ہے جب کہ یہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان مشرق اور مغرب میں جہاں کہیں بھی ہیں کمزور و بے سروسامان ہیں۔ اس کے باوجود اسلام روئے زمین پر تیزی سے پھیل رہا ہے۔تلوار اس وقت مغرب کے ہاتھوں میں ہے۔ اسلام بے تلوار پھیل رہا ہے اور یورپ و امریکہ کے ہزاروں لوگ اسلام میں جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔ یعنی اسلام کے خلاف استعمال ہونے والی عصری تلواروں کے سائے میں اسلام خود تلوار چلانے والوں کی ناک کے نیچے پھیل رہا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو المفصل فی الرد علی الحضارۃ الغربیۃ۔

بہت سے اسلامی ممالک ایسے ہیں جہاں ایک بھی اسلامی سپاہی نہیں آیا۔ جیسے انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ اور شمالی افریقہ کے علاوہ تمام افریقی ممالک وغیرہ۔

سنہ ۱۹۸۴ء میں ویٹیکن (Vatican) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو رسماً تسلیم کیا ہے۔

اسلامی یونیورسٹی روٹرڈیم (Islamic University of Rotterdam) ہالینڈ کے وائس چانسلر نے اعلان کیا ہے کہ سنہ ۱۹۸۴ء میں ویٹیکن نے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو رسماً تسلیم کیا ہے لیکن آج تک اس بات کو صیغہ راز میں رکھا گیا ہے۔

فارس نیوز ایجنسی ترکیہ روزنامہ دینی شفق سے ناقل ہے کہ اسلامی یونیورسٹی روٹرڈیم ہالینڈ کے وائس چانسلر پروفیسر احمد آک گووز (Prof. Ahmad Ak Goves) نے بتایا کہ یونائٹڈ آف چرچز (اتحادیہ کلیساہا) کی ایک خفیہ میٹنگ میں جو سنہ ۱۹۸۴ء میں پولش اٹالین (Polish italian) میں منعقد ہوئی، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری کو قبول کیا گیا مگر اس فیصلے کو پوشیدہ رکھا اور ابھی تک ان کی کوشش ہے کہ اسے پوشیدہ رکھا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس فیصلے کو ہالینڈ کے ایک محقق پادری نے ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیغمبری کو مسیحیوں نے رسماً تسلیم کیا'' کے عنوان سے ایک مقالہ میں بیان کیا ہے۔

آک گووز کہتے ہیں:

اس خفیہ نشست میں، جس میں دنیا کے تیس ملکوں کے چرچز کے نمائندگان نے شرکت کی، ایک کتابچہ تیار کیا ہے جس میں آیا ہے:

ممکن ہے کہ مسیحی، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیغمبری اللہ کے پیغمبروں کے سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر تسلیم کریں۔

وہ کہتے ہیں:

مشکل یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے درمیان موجود مشکلات اور یورپ کی اسلام دشمنی مثلاً ڈنمارک میں توہین آمیز کارٹون اور امریکہ، یورپ کا اسلام سے خوفزدہ ہونا مانع

ہے کہ مسلمان دنیا کو اسلام کی حقیقت سے روشناس کرائیں۔[1]

اسلام دنیا کا سب سے بڑا دین

وٹیکن نے دوسری بار اپنے اخبار میں لکھا ہے کہ اسلام سب سے بڑا دین بن گیا۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق وٹیکن نے اپنے اخبار میں دوسرے بار اعلان کیا ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے بڑا دین بن گیا ہے اور پوری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ موسیو ویٹوریو نے وٹیکن کے اخبار کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا:

پہلی مرتبہ ہم مسیحی دنیا کے بلند ترین سطح پر فائز دین والے نہیں رہے۔ مسلمان ہم سے آگے جا رہے ہیں۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑا دین اسلام ہے۔

وٹیکن کی طرف سے سال کی بہترین کتاب کے مؤلف ویٹوریو نے مزید کہا:

یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ مسلمان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ اضافہ بچوں اور جوانوں میں زیادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں مسیحیت سکڑ رہی ہے اور روز بروز کم ہو رہی ہے۔

یہ مسیحی محقق سنہ ۲۰۰۶ء کی شماریات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اظہار کرتا ہے:

دنیائے اسلامی کی شخصیتیں مختلف ممالک سے جمع ہوتی ہیں، اپنے آپ کو بین الاقوامی اجتماعات کے لیے آمادہ کرتی ہیں اور ان میں آپس بڑی ہماہنگی موجود ہے۔ جب کہ مسیحیوں کی تعداد میں کمی آ رہی ہے اور دنیا کی کل آبادی میں ۳۳ فیصد مسیحی ہیں۔

وٹیکن کے نمائندے نے اقوام متحدہ میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کی تصریح کرتے ہوئے کہا:

مسیحیت اپنے پیروکاروں سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔[2]

قابل توجہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں ۲۰ ملین لوگ مارے گئے اور دوسری جنگ عظیم میں ۳۵ ملین لوگ مارے گئے۔

ایک مغربی جریدے کے مطابق گزشتہ صدی میں رونما ہونے والی مختلف جنگوں میں ۲۰۷ ملین

---

[1] عجائب و مبطالب ص ۲۰۵ طبع کابل

[2] عجائب و مطالب ص ۳۳۳

انسان مارے گئے۔ ان جنگوں میں مغربی استعمار کا ہاتھ زیادہ ہے۔

اسلامی جنگوں میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں سنہ ۲ ہجری تا سنہ ۹ ہجری تک ہونے والی جنگوں میں ایک ہزار اٹھارہ (۱۰۱۸) افراد مارے گئے۔ ان میں ۲۵۹ مسلمان اور ۷۵۹ کافر تھے۔ جیسا کہ قاضی سلمان منصور نے اپنی کتاب سیرت رحمۃ للعالمین جلد دوم میں ذکر کیا ہے۔ جب کہ دوسروں نے اس سے کم ذکر کیا ہے۔

پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حمید اللہ اپنی کتاب ''رسول اکرم (ص) میدان جنگ میں'' لکھتے ہیں:

> محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ملین مربع میل کی مساحت پر حکومت کرتے تھے۔ یہ مساحت روس کے علاوہ پورے یورپ کی مساحت کے برابر ہے اور اس سرزمین پر کئی ملین کی آبادی رہتی تھی۔ ان وسیع وعریض علاقوں کو فتح کرنے کے لیے ۱۵۰ افراد کی قربانی دی گئی یعنی صرف ایک سو پچاس افراد میدان جنگ میں مارے گئے اور دس سال کی مدت میں ایک ماہ میں مسلمانوں میں ایک شہید کے حساب سے قربانی دی جاتی تھی۔[1]

Naples Eastern University کی پروفیسر Dr. Laura Veccia Vaglieri کہتی ہیں:

> مسلمان اپنے مفتوحہ علاقوں میں لوگوں سے کہتے تھے: جنگ سے ہاتھ اٹھاؤ، حکومت کو مالیات ادا کرو تو تمہیں وہی حقوق ملیں گے جو مسلمانوں کو ملتے ہیں۔

وہ کہتی ہیں:

> اسلامی فتوحات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے یہ کہنا اسلام تلوار کی طاقت سے پھیلا ہے بالکل جھوٹ ہے اور بہتان ہے۔[2]

ڈاکٹر ویکیا واگلیری کہتے ہیں:

> مسلمانوں میں کوئی تبلیغی نظام نہیں ہے پھر بھی ایشیا اور افریقہ میں اسلام بلا فاصلہ پھیل رہا ہے اور رکنے کا نام نہیں لے رہا۔ ہم آج یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ فاتح لشکر کی

[1] ملاحظہ ہو اسلام وسیمای تمدن

[2] اسلام وسیمای غرب

تلواروں سے اسلام پھیل رہا ہے۔[1]

اسلامی فتوحات اور صلیبی جنگوں میں موازنہ

عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کیا تو مسلمانوں کے ہاتھوں، پیروں اور سروں کا ایک ٹیلہ بنایا گیا۔ صرف مسجد عمر میں دس ہزار افراد نے پناہ لے رکھی تھی، سب کو قتل کر دیا گیا اور معبد سلیمان میں اس قدر خون بہا کہ گھوڑوں کے زانوں تک خون میں ڈوب گئے۔

یورپ کے ایک اہل قلم کلارک لکھتے ہیں:

یہ بات مسلم اور قطعی ہے کہ صلیبی جنگوں میں کسی قسم کا اخلاق اور خیر وخوبی دیکھنے میں نہیں آئی کیونکہ کوئی بھی حملہ آور خواہ وہ کسی قوم کسی زمانے کا ہو، شرارت، شہوت رانی، فسق وفجور میں ان مقدس صلیبی جنگوں سے بدتر دیکھنے میں نہیں آیا۔

اس کے مقابلے میں جب سنہ ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں نے بیت المقدس کو فتح کیا تو صلیبی لشکر کی عام معافی کا اعلان کیا۔

جون دیون پورٹ لکھتے ہیں:

جب بیت المقدس فتح ہوا اور شہر نے ہتھیار ڈال دیے تو ایک آدمی بھی نہیں مارا گیا اور اسیروں کے ساتھ بھی ہمدردی کے ساتھ پیش آیا گیا۔ اسی طرح اسپین کو جب مسلمانوں نے فتح کیا تو یہی سلوک روا رکھا گیا۔

لیکن جب اسپین کو مسیحیوں نے مسلمانوں سے چھڑایا تو تیس لاکھ مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ کتاب اسلام اور سائنس میں جدید تہذیب تاریخ کی سفاک ترین تہذیب کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

یہ وہ انسان ہے جس نے تین سو سالوں میں ایک ارب پچھتر کروڑ انسانوں کو قتل کیا اور آج دہشت گردوں کے ذریعے جس ننگ تاریخ درندگی کا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے اس میں بھی مغرب کا ہاتھ خون مسلم سے رنگین ہے جو ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔

[1] الاسلام والحضارة الغربيه

مصادر و مآخذ

۱۔ الإسلام يتحدى: وحید الدین خان
۲۔ آئین بندگی: محسن علی
۳۔ الله يتجلى فى عصر العلم: کریسی موریسون
۴۔ الاسلام على مفترق الطرق: محمد اسد نومسلم
۵۔ اسلام و سیمای غرب: موسوی لاری
۶۔ اسلام اور سائنس: محمد ظفر اقبال
۷۔ الارض فی المیزان: الکوز
۸۔ الاسلام والحضارة الغربية: السید مجتبی لاری
۹۔ بحار الانوار: مجلسی
۱۰۔ بناة الفكر العلمى فى الحضارة الاسلامية: حليمه الغراري
۱۱۔ تفسیر قمی: ابو الحسن علی بن ابراہیم قمی
۱۲۔ جسم کے عجائبات: تحریر و ترجمہ محمد علی سید
۱۳۔ الحضارة الغربية: ڈاکٹر شوقی ابو خلیل
۱۴۔ ڈی این اے جسم کی کتاب ہدایت: تحریر و ترجمہ محمد علی سید
۱۵۔ الدين فى تجارب الحياة البشرية
۱۶۔ رحلة فى الكون: یحییٰ ہارون
۱۷۔ رسول (ص) میدان جنگ میں: پروفیسر محمد حمید اللہ
۱۸۔ سیرت رحمۃ للعالمین: سلمان منصور
۱۹۔ ظلام من الغرب: محمد غزالی
۲۰۔ عجائب و مطالب: آیۃ اللہ محسنی قندھاری
۲۱۔ قصة الحضارة: ول ڈیورینٹ
۲۲۔ الکافی: کلینی۔ متوفی ۳۲۹ھ
۳۳۔ الکوثر فی تفسیر القرآن: محسن علی
۳۴۔ مختصر تاریخ موجودات: بل برائس
۳۵۔ مباحث علمی و دینی: آیۃ اللہ محسنی قندھاری
۳۶۔ المقاییس: احمد بن فارس بن زکریا
۳۷۔ مدخل الى موقف القرآن من العلم: عماد الدین خلیلی
۲۸۔ المفصل فى الرد على حضارة الغربية: ادریس کنبوری
۲۹۔ نهج البلاغة: الشریف الرضی
۳۰۔ الوسائل: الحر العاملی

*****

فہرست مطالب

ابتدائیہ ۳
یہاں دو موقف ہیں : ۳
۱۔الحادی مؤقف ۳
۲۔ ایمانی موقف ۴
فطرت ۷
فطرت کی لفظی تعریف ۹
تعریف حقیقی ۹
انسانی خصلتیں ۱۰
۱۔ روح نباتی ۱۰
۲۔روح حیوانی ۱۰
۳۔ روح انسانی ۱۰
غریزہ ۱۰
فطریات ۱۱
اول حقیقت طلبی ۱۱
دوم احسان پسندی ۱۲
سوم جمالیاتی ذوق ۱۲
چہارم دینداری ۱۲
دینداری اور انسانیت ۱۳
فطرت کی مخالف قوتیں: ۱۵
اول۔ احساس بے نیازی ۱۵

دوم۔ تکبر اور خود بینی ۱۶
سوم۔ ظن پرستی ۱۷
قرآن اور فطرت دینی ۱۷
فطرت اور کشش ۲۳
فطرت و اخلاق ۲۷
فطرت سے سوال ۲۹
جسم کی طبیعتیں چار ارکان پر قائم ہیں: ۳۰
ا۔ ہوا اور نسیم ۳۰
۲۔ زمین ۳۰
۳۔ غذا ۳۰
۴۔ پانی ۳۰
فطری و غیر فطری میں فرق ۳۰
پہلی علامت ۳۱
دوسری علامت ۳۱
تیسری علامت ۳۱
چوتھی علامت ۳۱
غیر فطری امور: ۳۱
ا۔ پوری تاریخ انسانی میں دینداری کا موجود ہونا ۳۱
۲۔ احساس دینداری ۳۴
۳۔ دینداری ماحول کی پیداوار نہیں ۳۳
۴۔ دینداری طاقت سے ختم نہیں کی جاسکتی ۳۴
ایمان اور کردار ۳۴
برہان فطرت ۳۵
دین کی پیدائش کے محرکات ۳۶
برہان امکان ۳۶
ا۔خوف ۳۶
۲۔ جہالت ۳۷

۳۔ استحصال ____ ۳۸
۴۔ میراث گزشتگان ____ ۴۰
دین اخلاقی ضرورت ____ ۴۰
دین نفسیاتی ضرورت ____ ۴۱
ایمان اور معاشرہ ____ ۴۱
ایک اہم سوال ____ ۴۳
۱۔ ثابت قوانین ____ ۴۳
۲۔ متحرک قوانین ____ ۴۵
پہلی قسم۔ ثانوی قوانین ____ ۴۵
دوسری قسم ____ ۴۷
تیسری قسم ____ ۴۷
ایمان کے اثرات ____ ۴۷
حوادث کا مقابلہ ____ ۴۹
علم اور ایمان ____ ۴۹
دو عبرتناک خطوط ____ ۵۰
راز حیات ____ ۵۱
سائنسی علوم اور دین ____ ۵۲
کائنات ____ ۵۳
کائنات کی ابتدا و انتہا مربوط ہے ____ ۵۹
سائنسی تھیوری پر قرآن کی تطبیق ____ ۶۳
سورج ____ ۶۷
سورج کی حیات آفرین خدمات ____ ۶۷
زمین ____ ۶۹
حجم زمین ____ ۷۰
بادل ____ ۷۰
چاند ____ ۷۱
چاند کی خدمات ____ ۷۱

زمین مہربان ماں ۷۲
فضائے ارضی ۷۲
ہوا میں تناسب ۷۳
علّت اول۔ قانون سببیت ۷۴
نباتات میں اللہ کی آیات ۷۵
حیوانات و نباتات میں تبادلہ حیات ۷۵
نباتات کی حیات بخش خدمات ۷۵
ایک اہم درس توحید ۷۷
ترکیب عناصر ارضی ۷۷
درخت کے پتوں سے تین اہم کام ۷۸
۱۔بخارات ۷۸
۲۔ تنفس ۷۸
۳۔ کاربن گیری ۷۸
پانی اور مٹی ۷۸
پانی ۷۹
پانی کے ذخائر ۸۰
پانی روز اول سے موجود ہے ۸۱
پہاڑ اور شیرین پانی ۸۱
اتفاقیہ ۸۳
مسئلہ حیات ۸۵
اتفاقیہ ۸۸
مادے کی خاصیت ۸۹
نیچر (فطر) تعلیل توحید ۹۰
نیچر اور تنظیم ۹۰
پلازما (Plasma) کی خدمات ۹۱
عناصر کی ترکیب ۹۶
حرکت قلب ۹۷

یاد۔ ذاکرۃ ۹۷
دماغ ۹۷
سائنسی نظریہ اور قرآن ۹۸
عقل ۹۹
نظریۂ ارتقا ۹۹
دنیائے خلیات ۱۰۱
شعبہ پاور پلانٹ ۱۰۴
۲۔ شعبہ کیمیکل پلانٹ ۱۰۴
۳۔ شعبہ ہدایت ورہنمائی ۱۰۵
ڈی این اے کیا ہے؟ ۱۰۵
شعبہ جینز (Genes) ۱۰۶
۵۔ شعبہ پیغام رسان۔ آر این اے ۱۱۰
پیغام بر آر این اے۔ ۱۱۱
۶۔ شعبہ حفاظتی حصار ۱۱۱
۷۔ شعبہ مواصلاتی نظام ۱۱۲
خلیے کے تخلیقی معجزات ۱۱۳
عصمت نسواں ۱۱۴
جنس کا تعین ۱۱۵
سوئے منزل ۱۱۵
عالم اصغر کی تخلیق ۱۱۶
خلیے کی قدرت شناخت ۱۱۹
خلیے کی اقسام ۱۲۰
ہارمونز (Hormones) اور جنس ۱۲۰
تنفّس ۱۲۰
ہمارا ارادہ ۱۲۲
جگر ۱۲۳
جگر کی شعوری خدمات ۱۲۴

معدے کے خلیوں کا حیرت انگیز شعور ۱۲۶
خلیوں کا مواصلاتی نظام ۱۲۶
گردے ۱۲۶
گردوں کے فرائض ۱۲۷
گردوں میں نظام فشار خون ۱۲۸
خون کی صفائی کا عمل ۱۲۸
مثانہ ۱۲۹
دردزہ اور ماں کا دودھ ۱۳۰
پیاس کیوں لگتی ہے؟ ۱۳۱
حالت خوف۔ ایمرجنسی ۱۳۲
پھیپھڑے ۱۳۲
دفاعی فوج ۱۳۴
خودکش حملہ ۱۳۴
خون ریزی ہو جائے ۱۳۵
ستون جسم۔ ذرائع مواصلات ۱۳۶
ہڈی ۱۳۷
گردن کے غدود کا شعوری کردار ۱۳۸
خلیے کا شعوری کردار ۱۳۸
ہاتھ ۱۳۸
پاؤں ۱۳۹
ناک ۱۴۰
دانت ۱۴۱
آب دہن ۱۴۲
حلق ۱۴۲
معدہ ۱۴۲
آنتیں ۱۴۳
آنتوں کے چند حصے ۱۴۴

ہمارے جسم کے بال ۱۴۴
جسم میں خون کی گردش ۱۴۵
دل ۱۴۷
دماغ ۱۴۸
لبلبہ۔ انسولین کا کارخانہ ۱۵۰
اپنے نفس پر حاکمیت ۱۵۱
۱۔دل کی دھڑکن ۱۵۱
۲۔تنفس ۱۵۱
۳۔قوت ہاضمہ ۱۵۱
۴۔آنتوں کی کارکردگی ۱۵۱
۵۔دفاعی نظام ۱۵۱
حیوانات ۱۵۳
مچھلی ۱۵۳
مچھلیوں کی دوسری قسم ۱۵۳
پروانہ ۱۵۴
شہد کی مکھی ۱۵۴
بار آوری ۱۵۵
دستہ بندی ۱۵۵
مکھیوں کا چھتہ ۱۶۵
پھلوں کا رس ۱۵۶
ملکہ کی سلطنت کا چشم کشا نظام ۱۵۶
چھ ہزار عدسوں والی آنکھ ۱۵۶
ملکہ ۱۵۷
ملکہ کی ذمہ داری ۱۵۷
الحاد کے محرکات ۱۵۹
پہلا سبب۔ اللہ کے بارے میں غلط تصور ۱۶۱
دوسرا سبب۔ جہالت ۱۶۲

تیسرا سبب۔ پرانے نظریات کا خرافات ہونا ثابت ____ ۱۶۲
چوتھا سبب۔ چرچ کی درندگی ____ ۱۶۳
پانچواں سبب۔ سرمایہ دارانہ نظام ____ ۱۶۵
چھٹا سبب۔ اقتصادی نظریات ____ ۱۶۵
ساتواں سبب۔الحادی نظریات کی طاقت ____ ۱۶۵
آٹھواں سبب۔ یورپ کے مقابلے میں عالم اسلام کی شکست ____ ۱۶۶
نواں سبب۔ جدید طرز زندگی ____ ۱۶۶
دسواں سبب۔ رھبانیت ____ ۱۶۶
الحاد کے اثرات ____ ۱۶۹
۱۔ بے چینی، بے سکونی۔ ____ ۱۹۹
۲۔ ذاتی، شخصی مفاد پرستی ____ ۱۶۹
۳۔ جرائم پیشہ ____ ۱۶۹
مغربی تمدن ____ ۱۶۹
حقائق کا مسخ ____ ۱۷۱
مغرب کا انسان ____ ۱۷۴
مغربی تمدن میں زندگی سے مایوسی۔خودکشی کا روز افزون رجحان ____ ۱۷۴
ازواج و طلاق ____ ۱۷۶
جدید تمدن اور کرۂ ارض کا المیہ ____ ۱۷۶
۲۔ ہوا کی آلودگی ____ ۱۷۷
۳۔ اوزون کا سوراخ ____ ۱۷۷
۴۔ قدرتی نظافت ____ ۱۷۷
۵۔ درجہ حرارت میں اضافہ ____ ۱۷۸
۶۔ جنگلات کی تباہی ____ ۱۷۸
۷۔ پانی کی آلودگی ____ ۱۷۸
ردیات (Waste) ____ ۱۷۸
عالم اسلام کی علمی خدمات ____ ۱۸۱
طلیطلة (Toledo) کی درسگاہ ____ ۱۸۳

مسلمان سائنسدان ________ ۱۸۴
۱۔جابربن حیان ________ ۱۸۵
۲۔ خوارزمي ________ ۱۸۶
۳۔ابن ربّن الطبري ________ ۱۸۶
۴۔ الفرغاني ________ ۱۸۶
۵۔اولادموسی ________ ۱۸۶
۶۔ کندي ________ ۱۸۷
۷۔رازي ________ ۱۸۷
۸۔ البستاني ________ ۱۸۸
۹۔ فارابي ________ ۱۸۸
۱۰۔عبدالرحمن صوفی ________ ۱۸۸
۱۱۔ابوالوفاءبوزجانی ________ ۱۸۹
۱۲۔المجریطی ________ ۱۸۹
۔ابن جزار ________ ۱۸۹
۱۴۔ الزهراوی ________ ۱۸۹
۱۵۔ الکرخی ________ ۱۹۰
۱۶۔ ابن سینا ________ ۱۹۰
۱۷۔ابن الهیثم ________ ۱۹۱
۱۸۔البیروني ________ ۱۹۲
۱۹۔ابن رضوان ________ ۱۹۳
۲۰۔الزرقالي ________ ۱۹۳
۲۱۔ابن جزله ________ ۱۹۳
۲۲۔ عمرخیام ________ ۱۹۴
۲۳۔ابن باجه ________ ۱۹۴
۲۴۔ابومروان ابن زهر ________ ۱۹۴
۲۵۔ ابن طفیل ________ ۱۹۵
۲۶۔ابن رشد ________ ۱۹۵

۲۷۔ابن الرزاز ________ ۱۹۶

۲۸۔البطروجی ________ ۱۹۶

۲۹۔ابن البیطار ________ ۱۹۶

۳۰۔نصیر الدین الطوسی ________ ۱۹۷

۳۱۔ابن النفیس ________ ۱۹۸

۳۲۔الحسن المراکشی ________ ۱۹۸

۳۳۔قطب الدین شیرازی ________ ۱۹۸

۳۴۔ابن البناء ________ ۱۹۹

۳۵۔ابن الشاطر ________ ۱۹۹

۳۶۔الکاشی ________ ۱۹۹

۳۷۔الغ بیگ ________ ۲۰۰

کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟ ________ ۲۰۱

اسلام دنیا کا سب سے بڑا دین ________ ۲۰۳

اسلامی جنگوں میں ________ ۲۰۴

اسلامی فتوحات اور صلیبی جنگوں میں موازنہ ________ ۲۰۵

مصادر ________ ۲۰۷

*****